معارف

دسمبر ۲۰۱۷ء

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰روپئے۔ فی شمارہ ۲۵روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴روپئے
دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰روپئے
ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI
196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN
LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN
Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
(Office Mobile) 09170060782

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۰ ماہ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۱۷ء عدد ۶

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

ہالینڈ کے شہر ہیگ میں قائم انٹرنیشنل کریمنل ٹریبیونل نے سابق سرب فوجی کمانڈر اور سری برینیکا (Srebrenica) کے قاتل ۷۴ سالہ راٹکوملاڈک (Ratco Mladic) کے خلاف مقدمہ میں اپنا فیصلہ سنا دیا، اسے نسل کشی، جنگی جرائم اور انسانیت کے خلاف جرائم کا ملزم پایا گیا۔ اسے عمر قید کی سزا دی گئی۔ بوسنیا میں بہت سے لوگوں نے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا اور اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ یہ سفّاک قاتل اپنی سزا سننے کے لیے زندہ رہا۔ لیکن کیا اس سزا سے انصاف کے تقاضے پورے ہوگئے اور کیا یہ ان جرائم کی قرار واقعی سزا ہے جس سے اس کا دامن داغدار ہے۔ اس کی قیادت میں سرب فوجوں نے سیراجیو، سری برینیکا اور خطہ کے دوسرے شہروں اور بستیوں میں جو نا قابل بیان اور نا قابل تصور مظالم کیے، تین برسوں کے محاصرہ کے دوران ان کے ہاتھوں اس علاقہ پر جو کچھ گذری، جتنے لوگ قتل ہوئے اور جو اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور جتنی خواتین ان کی بربریت کا شکار ہوئیں، ان سب کا حساب لگایا جائے تو اتنے سنگین جرائم کے مقابلہ میں یہ سزا یکسر بے حقیقت ہوکر رہ جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسے ایک ہزار زندگیاں ملیں اور اسے ایک ہزار بار عمر قید کی سزا دی جائے تو بھی ان مظالم کی تلافی ممکن نہیں جو اس کے ہاتھوں انجام پائے۔ ایک طویل مدت تک ایک مفرور کی زندگی گذارنے اور اتنے دنوں سلاخوں کے پیچھے مقید رہنے کے دوران اس نے اپنے سیاہ کارناموں پر ضرور غور کیا ہوگا، دنیا بھر میں اس کے مظالم کے سلسلہ میں انصاف پسند شہریوں کا جو ردعمل سامنے آیا وہ بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا ہوگا، ۵۰۰ دن تک چلنے والی مقدمہ کی سماعت کے دوران ۶۰۰ لوگوں کی گواہیاں اور وکیلوں کی بحث اور ججوں کے ریمارکس بھی اس نے سنے ہوں گے لیکن بعض انسان اتنے درندہ صفت ہوتے ہیں اور ان کی فطرت اس حد تک مسخ ہوجاتی ہے کہ وہ برائی کو برائی اور ظلم کو ظلم سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوجاتے ہیں۔ ملاڈک نے مقدمہ کی سماعت کے دوران اور فیصلہ کے دن عدالت میں جس طرز عمل کا اظہار کرتا رہا اس سے واضح ہے کہ اس کو نہ تو اپنے سنگین جرائم کا کوئی احساس ہے اور نہ اس پر کوئی تاسف بلکہ شاید اس کو ان پر فخر ہے۔ جرم کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو کہ یہ فیصلہ بہت دیر میں آیا اور یکسر ناکافی ہے۔ اصل فیصلہ تو داور محشر کی عدالت ہی میں ہوگا۔

مشرقی یوروپ کا ایک بڑا علاقہ صدیوں تک خلافت عثمانیہ کے زیر نگیں رہا۔ اس میں سابق یوگوسلاویہ کا بوسنیا علاقہ بھی شامل تھا جو جنوب مشرقی یوروپ میں واقع ہے۔ یہ علاقہ ۱۴۶۳ء میں خلافت عثمانیہ کے قبضہ میں آیا اور ۱۸۷۸ تک ان کے زیر اقتدار رہا۔ اس طویل مدت میں یہاں بڑے پیمانے پر مسلم آبادیاں قائم ہوئیں اور یہ خطہ مسلم تہذیب وتمدن کے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ عثمانی تسلط سے آزادی کے بعد مختلف مراحل سے گذرتا

ہوا یہ خطہ جنگ عظیم دوم کے بعد سوشلشٹ ریپبلک آف یوگوسلاویہ کا حصہ بن گیا۔ پھر حالات نے کچھ ایسا موڑ لیا کہ یہ خطہ نسلی مخاصمت کی بارود کے ڈھیر میں تبدیل ہوگیا جس کے بھڑک اٹھنے کے لیے بس ایک چنگاری کافی تھی۔ جس خطہ کو آج بوسنیا ہرزی گووینا کے نام جانا جاتا ہے وہاں بوسنیائی مسلمانوں، جن کو بوسنیاک (Bosniak) کے نام سے جانا جاتا ہے، کروٹ اور سرب نسلوں کی ملی جلی آبادی تھی البتہ ان میں غالب اکثریت سربوں کی تھی۔ قوم پرستی کے انتہا پسندانہ تصور کے تحت سربوں نے اس خطہ کو خالص سرب علاقہ میں تبدیل کرنے اور اسے دوسری نسلوں خاص طور سے مسلمانوں سے پاک کرنے کے مقصد سے وہاں نسلی تطہیر کی مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم میں ترکوں کے پانچ سو سالہ دور حکمرانی کے خلاف انتقام کا عنصر بھی واضح طور پر شامل تھا۔ بارود کے ڈھیر کے لیے یہ چنگاری کافی تھی۔ اس کے نتیجہ میں ۱۹۹۲ء میں وہاں شدید خانہ جنگی شروع ہوگئی، جو پوری شدت سے ۱۹۹۵ء تک جاری رہی۔ اس پورے عرصہ میں ملاڈک سرب افواج کا چیف آف اسٹاف تھا اور یہ جنگ سربوں نے اسی کی قیادت میں لڑی۔ سیراجیو تین سال تک سخت محاصرہ کی زد میں رہا اور وہاں وسیع پیمانے پر جان و مال کا نقصان ہوا۔ اسی دوران سری برینیکا کا حادثہ فاجعہ رونما ہوا۔ سری برینیکا سیراجیو سے تقریباً اسّی کلومیٹر دور ایک پہاڑی شہر ہے۔ سرب فوجوں کے ہاتھوں یہاں جولائی ۱۹۹۵ء میں ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جس کی مثال جنگ عظیم کے بعد یوروپ میں نہیں ملتی۔ اس شہر کے مسلمان مردوں اور لڑکوں کو آبادی سے الگ کر کے پانچ دن کے عرصہ میں آٹھ ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ناٹو کی فوجی مداخلت اور سرب علاقوں کی بڑے پیمانے پر بمباری کے نتیجہ میں وہ معاہدہ ہوا جسے Dayton Agreement کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس خطہ کا موجودہ نقشہ اسی معاہدہ کی دین ہے۔ جنگ بندی کے بعد راٹکو ملاڈک ۱۶ سال تک گرفتاری سے بچتا رہا اور بالآخر ۲۰۱۱ میں گرفتار ہوا اور طویل سماعت کے بعد اب اس کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا۔

تحریک حماس ۲۰۰۷ میں فتح کے ساتھ ایک طویل اور خونیں کشمکش کے بعد غزہ میں اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس دوران اس نے نہایت سخت محاصرہ اور بہت سی مشکلات کے باوجود نہ صرف کامیابی سے اسرائیل کا مقابلہ کیا بلکہ غزہ پٹی کے لیے ایک موثر انتظامی اور سیکورٹی نظام بھی قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے باوجود اس بات میں شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ غزہ کے باشندوں کو اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ مزید براں فتح اور حماس کے اختلافات کے نتیجہ میں فلسطینیوں کی اجتماعی طاقت کمزور ہوئی ہے۔ اگر دونوں فریقوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی کوئی قابل عمل صورت نکل آئے تو تحریک مزاحمت کو اس سے بڑی تقویت حاصل ہوگی۔ اس ضرورت کے احساس کے تحت اس سے پہلے بھی اس سلسلہ میں کوششیں ہو چکی ہیں لیکن وہ نتیجہ خیز

ثابت نہیں ہوئیں۔اسی طرح کی ایک کوشش گذشتہ دنوں مصر کی سرپرستی میں انجام پذیر ہوئی۔طویل گفت وشنید کے بعد فریقین نے قاہرہ میں ۱۲/اکتوبر کو ایک معاہدہ پر دستخط کردیے اور اس طرح بظاہر ایک مخلوط حکومت کے قیام کی راہ ہموار ہوگی۔

اس مصالحت کا دنیا بھر میں استقبال کیا گیا۔خود ارض فلسطین میں اس کے بارے میں بڑے والہانہ جذبات کا اظہار کیا گیا۔اس سے فلسطین کے لیے ایک بہتر مستقبل کی راہ ہموار ہونے کی توقع کی جارہی ہے۔اس معاملہ میں مصر کی خصوصی دلچسپی اور تحریک حماس کے سلسلہ میں مصر کے رویہ میں بنیادی تبدیلی کی وجہ سے بھی اور مشرق وسطیٰ اور دنیا کے بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے بھی یہ امید کی جارہی ہے کہ ماضی کے برخلاف یہ معاہدہ شاید زیادہ دیرپا ثابت ہو۔سینائی کی شورش پر قابو پانے کے لیے مصر کو حماس کے تعاون کی ضرورت ہے۔خطہ میں قطر کے اثرات کو کم کرنے کا مسئلہ بھی مصر کی ترجیحات میں شامل ہے۔غزہ کے طویل محاصرہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے روز افزوں مسائل اور عالمی سطح پر الگ تھلگ پڑ جانے کی وجہ سے حماس بھی شاید اس کی کامیابی میں دلچسپی لے۔اس کے باوجود کئی ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے یہ معاہدہ بھی اندیشوں میں گھرا ہوا ہے۔اس کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں مستقبل کے لیے واضح خطوط کار فراہم نہیں کیے گئے ہیں۔گذشتہ دس سال کی مدت میں حماس نے غزہ میں جو انتظامی ڈھانچہ تیار کیا ہے اس کا کیا بنے گا۔فلسطینی اتھارٹی کے مختلف شعبوں میں ان کا انضمام بہت آسان نہیں ہوگا۔لیکن سب سے زیادہ مشکل شاید سیکورٹی کے شعبہ میں پیش آئے۔حماس اپنی طاقت اور قوت کے سرچشمہ اپنے مسلح دستوں کو قربان کرنے کے لیے شاید ہی تیار ہو۔مغربی کنارے پر سیکورٹی کا جو نظام رائج ہے اگر غزہ میں بھی وہی نافذ کیا جائے گا تو سخت مشکلات پیش آئیں گی۔فلسطینی اتھارٹی کا اسرائیلی اینٹلی جنس اور سیکورٹی سروسز کے ساتھ جس طرح کا تال میل ہے اور عملاً وہ جس طرح اسرائیل کی ماتحتی میں کام کرتی ہیں اس کے پیش نظر یہ ضروری ہوگا کہ نہ صرف ہتھیاروں کے پورے ذخیرہ کو، جو حماس نے اسرائیل سے کسی ممکنہ جنگ کے لیے اکٹھا کر رکھا ہے، مکمل طور پر تباہ کردیا جائے بلکہ غزہ میں اس کے سیکورٹی کے نظام کو بھی پوری طرح ختم کردیا جائے۔اس کے لیے شاید حماس تیار نہ ہوسکے اور اگر حالات کے دباؤ میں وہ تیار بھی ہوگئی تو اس کے نتیجہ میں غزہ میں اتنی بے اطمینانی پیدا ہوگی کہ اس پر قابو پانا مشکل ہوجائے گا۔ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس سلسلہ میں امریکہ اور اسرائیل کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔چنانچہ جہاں یہ بات بہت خوش آیند ہے کہ فلسطینیوں کے دونوں دھڑوں میں اتفاق واتحاد کا امکان پیدا ہوا ہے وہیں اس منزل تک پہنچنے میں بہت سی مشکلات اور رکاوٹیں ہیں جن پر قابو پانا آسان نہیں۔اس دوران اگر امریکہ نے یروشلم کو اسرائیل کے دارالحکومت کی حیثیت سے تسلیم کرلیا اور اپنا سفارت خانہ وہاں منتقل کرنے کی کارروائی شروع کردی تو حالات کیا رخ اختیار کریں گے اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

مقالات

شبلی کا رسالہ سیرت

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

(۳)

بیان شبلی میں تبدیلی: رسالہ سیرت کے متن میں شبلی کے متعدد بیانات کو فارسی مترجم محترم نے اوران کی تابعداری میں اردو مترجم محترمہ نے بدل دیا ہے جیسا کہ ایک مثال اوپر حکومت کسریٰ کے سال کی تعیین میں ولادت نبوی کے ضمن میں گزرچکی۔ شبلی نے بیالیسواں سال لکھا اور وہ بھی الفاظ میں: ''وھی السنة الثانیة والاربعون من ملک کسریٰ'' جو بارہ ربیع الاول عام الفیل کے موافق ومطابق سال تھا۔ مگر مولانا فراہی نے اس کو چالیسواں بنادیا: ''درسنہ ۴۰ از حکومت کسریٰ'' جس کا وفادارانہ اردو ترجمہ ''۴۰ رجلوس کسریٰ'' کیا گیا۔

متن عربی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد مدینہ کی تاریخ بارہ ربیع الاول بروز دوشنبہ: ''لاثنتی عشرة لیلة خلت من ربیع الاول یوم الاثنین'' دی ہے۔ فارسی ترجمہ میں نہ جانے کیوں اسے ''یازدہم'' بنادیا گیا ہے اوراس کی طرف مرتب گرامی نے بھی حاشیہ میں اشارہ کیا ہے۔

عربی متن میں قبا میں قیام نبوی کے چارایام: ''الاثنین والثلاثاء والاربعاء والخمیس'' کی خاص طور سے صراحت کی گئی ہے۔ مگر فارسی ترجمہ میں تلخیص کرکے ''وتا پنج شنبہ درآنجا قیام فرمود'' کردیا ہے۔

اسقاط کی بحث تنقیدی میں مذکورہ بالا اورمرتب گرامی کی مندرجہ ذیل تبدیلیوں کا ذکر بڑی صراحت سے آتا رہا ہے مگر بہت سی نظر مرتب سے اوجھل رہ گئیں۔

مرتب گرامی نے جن تبدیلیوں کا ذکر اپنے حواشی میں کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

پروفیسر، صدر، ڈائریکٹر (سابق) ادارہ علوم اسلامیہ وشاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۱۔آغاز رسالت کے باب میں متن عربی میں اکیس آیات ہیں۔انھوں نے ساقط کردہ کی تعداد نہیں بتائی۔

۲۔صفات قدسی کے بیان میں کہا ہے کہ بعد کا فقرہ متن میں مقدم ہے۔

۳۔متن عربی میں سورہ یٰسین کی دوسری آیت ہے اور فارسی متن میں سورہ قیامہ کی آیت:۳۸ ہے۔

۴۔اسلام عمر بن خطابؓ میں لکھا ہے کہ ''ازاں بیچارگان جفاہا کشیدند''۔متن عربی میں ذکر اسلام عمرؓ کے بعد اور قبل ''اما رسول اللہ'' آیا ہے۔

ان کے علاوہ مرتب گرامی نے فارسی ترجمہ کے مطبوعہ نسخہ کی بہت سی اغلاط کی تصحیح کی ہے اور اپنے حواشی میں ان کی وضاحت بھی کردی ہے۔انہوں نے بعض بعض واقعاتی اغلاط یا طباعت کی کارستانیوں کی اصلاح متن میں بھی کی ہے۔عربی اور فارسی دونوں کے متون میں اور اردو میں بھی،لیکن نہ جانے کیوں بہت سی واقعاتی اغلاط کی تصحیح متون میں نہیں کی جبکہ متعدد کی تصحیح کرکے متنی تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

تراجم کے اضافات: عربی رسالہ سیرت کے متن پر دونوں فارسی اور اردو مترجمین نے تشریحی،توضیحی اور بسا اوقات تنقیدی اضافات کا گراں قدر کام کیا ہے۔فارسی مترجم گرامی کے تمام تر اضافے ان کے متن ترجمہ کے ضمن میں آئے ہیں اور وہ سب کے سب تشریحی توضیحی زیادہ ہیں اور تنقیدی کم،حواشی بالکل ناپید ہیں۔اسقاط وغیر وفادار ترجمہ کی دو بحثوں میں ان کی طرف اشارہ بھی کیا جاتا رہا ہے اور مرتب گرامی کے ترجمہ فارسی پر بعض حواشی کا بھی برابر حوالہ آتا رہا ہے۔مثلاً جوامع الکلم کا ایک تشریحی اضافہ ہے:''کہ معنی بسیار بلفظ اندک بیان نمودی''۔اسی طرح دو چار مقامات پر ان کے تشریحی اضافات ملتے ہیں۔اس کے برعکس اردو ترجمہ میں شاہ بانو نے فارسی ترجمہ کے متن میں اضافات مترجم وافادات فراہی کے علاوہ اپنے خاص تشریحی وتنقیدی اضافے کیے ہیں۔وہ دو قسم کے ہیں:اول متن ترجمہ اردو کے ضمن میں وہ قوسین میں یا بلاقوسین بھی متعدد تشریحی فقروں اور جملوں کا اضافہ کرکے معانی کی تفہیم کرتی ہیں جیسے عبدالمطلب کے ذکر وفات میں اضافہ قوسین ملتا ہے:(آپ کے دادا)، ابوطالب کے ذکر کفالت میں (آپ کے چچا)،حضرت علیؓ کے ذکر خیر میں فارسی کے اضافہ فراہی پر

مزید اضافہ (اور آنحضرتؐ ہی ان کے کفیل تھے)، حضرت عمرؓ کے ارادہ قتل نبوی سے توجہ مبذول کرنے کی خاطر ایک شخص کا جملہ کہ "خود تمہاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں" کا اضافہ فارسی ترجمہ کے علاوہ عربی متن شبلی پر بھی ہے۔

اردو ترجمہ کے یہ تشریحی حاشیے یا اضافے ان کے عناوینِ مباحث یا سرخیوں میں بھی نظر آتے ہیں اور وہ متن عربی اور اس کے فارسی ترجمہ کے اوپر اضافاتِ خاص ہیں جیسے ولادت، یتیمی، رضاعت، بچپن، سفر شام، نکاح، اولاد، تبلیغ علی الاعلان، قریش کی مخالفت اور ایذا رسانی، قریش اور بنی ہاشم میں قطع تعلقات"، واپسی مہاجرین بسوئے مکہ، زمانہ حج میں تبلیغ، مدینہ میں اسلام، آنحضرتؐ کے متعلق کفار قریش کا مشورہ، آنحضرتؐ اور ابوبکرؓ کی مکہ سے روانگی اور غار ثور میں قیام" وغیرہ۔ ان کا ذکر تفصیل سے متن عربی اور ترجمہ فارسی کے دونوں تجزیاتی مباحث میں برابر آتا رہا ہے اور وہ پوری کتاب میں موجود و کارفرما ہیں۔ ان ذیلی عناوین کے اوپر جامع مباحث کے لیے شاہ بانو نے جامع قسم کے عناوین بھی اضافہ کیے ہیں جیسے غزوات وسریات کا عنوان جس کے تحت تمام غزوات وسرایا کا ذکر کیا ہے جو متن عربی وترجمہ فارسی میں آئے ہیں۔ ان اضافات عناوین سے مترجم اردو کی سخن فہمی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کو رسالہ سیرت شبلی اور اس کے ترجمہ فارسی کے علاوہ دوسری کتب سیرت اور بعض مصادر سیرت کا بھی علم وذوق حاصل رہا تھا۔

اردو مترجمہ شاہ بانو کے دوسری قسم کے اضافات ان کے حواشی ہیں جو مختلف اشخاص و معاملات، واقعات ومکانات اور اصطلاحات وحقائق پر انہوں نے تشریح وتوضیح کے لیے یا متن رسالہ کے نقد وانتقاد کی خاطر قریب قریب تمام مباحث رسالہ میں ترجمہ کے نیچے لگائے ہیں۔ ان میں سے کچھ مختصر، ایک دو یا چند سطری ہیں اور بعض بعض ایک بڑے پیراگراف پر مشتمل ہیں۔ وہ مترجم کے دائرہ کار کے باہر ایک ناقد فن کے حواشی ہیں۔ ان کی معلومات سیرت اور گرفت مصادر کے علاوہ ان کی تنقیدی بصیرت کے بھی آئینہ دار ہیں۔ ان کے چند مختصر حواشی میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

۱۔ آپ کی یتیمی کے حوالہ سے حاشیہ ہے: "اور یتیم وہی کہلاتا ہے جس کا والد سن شعور سے پہلے وفات پا جائے"۔ اسی پر ان کا تنقیدی حاشیہ ہے کہ آپ کے والد آپ کے پیدا ہونے سے قبل ہی وفات پا گئے تھے اور سورہ ضحیٰ کی آیت کے علاوہ روایات کا حوالہ وترجیح نقل کی ہے۔

۲۔''حضرت حلیمہ سعدیہؓ سے پہلے ثویبہؓ نے چند روز تک آنحضرتؐ کو دودھ پلایا تھا۔آٹھ دن کی عمر سے چار برس کی عمر تک آپ حلیمہ سعدیہ کے پاس رہے'' متن عربی اور ترجمہ فارسی دونوں نے رضاعت ثویبہؓ کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی دونوں میں خانہ سعدیہ میں قیام نبوی کی مدت کا تعین ملتا ہے۔

۳۔کسریٰ ایران کے بادشاہ کا لقب ہوتا تھا اور اس کی تائید میں خاقان وفغفور چین، قیصر روم، قیصر جرمن اور قیصر ہندوستان (ملک معظم برطانیہ) کی مثالیں دی ہیں۔ولادت نبوی کے حوالہ سے شاہی نوشروانِ عادل کا حوالہ دے کر بتایا ہے کہ سن عیسوی کے حساب سے یہ مبارک دن ۴؍مئی ۵۷۱ تھا (جو غلطی سے ۵۷ء چھپ گیا)۔

۴۔ابرہہ نامی بادشاہ یمن کے حملہ مکہ پر تشریحی نوٹ خاصا بڑا، واقعہ فیل پر لگایا ہے جو پانچ سطری ہے۔

۵۔ابوطالب کو کفالت نبوی کی وصیت پر حاشیہ لگایا ہے کہ'' وہ اور آپ کے والد عبداللہ دونوں ایک ماں کے بطن سے تھے''۔

۶۔حضرت خدیجہؓ کی سماجی نسبی اور مالی حیثیت پر ان کا خاصا بڑا نوٹ/ حاشیہ ہے۔

۷۔''حضرت حمزہؓ آپ کے چچا اور دودھ شریک بھائی تھے جنھوں نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا''۔

۸۔ابولہب کی رشتہ داری اور مخالفتِ اسلام پر سورہ تبت کے حوالہ سے ایک حاشیہ ہے۔

۹۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اظہار کہ آپ کے ہاتھ میں آفتاب و ماہتاب رکھ دیے جائیں تو بھی تبلیغ جاری رکھیں گے کا مطلب بتایا ہے۔

۱۰۔اسی طرح بلال حبشیؓ، لات وعزیٰ، حضرت عمرؓ کے بہن و بہنوئی کے ناموں کے علاوہ متعدد دوسرے حواشی ہیں۔دوسرے مختصر تشریحی حواشی میں شامل ہیں: طائف کا محل وقوع اور شادابی، قبہ کے معنی ومقام، انصار کی تشریح، ایام تشریق کی تعیین، حضرت اسماءؓ کے ذات النطاقین کا لقب، قبا کی تعیین، ناقہ کے معنی، عقد مواخات کے معنی، غزوہ وسریہ کا فرق، نماز کی فرضیت وغیرہ، لواء اور روایت کا فرق، بنواسرائیل کی تشریح، حدیبیہ کی لغوی ومقامی تشریح، سندرہ نامی عورت کی تشریح، تکبیر وتہلیل کا معنی وفرق، حضرت ابوسفیان کا فخر وناز، سرداری، اولاد غالب کی مراد (مرتب)، نعمان بن المنذر کی تعیین، والی بہ معنی حکمراں، وفد کے معانی اور حجۃ الوداع کی تشریح۔

اردو کے بڑے اور مبسوط حواشی میں سے دو کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ ان میں چند کا حوالہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

۱۔عرب مذاہب قبل بعثت نبوی پر ان کا نوسطری حاشیہ بہت عمدہ اور گراں قدر اضافہ ہے۔

۲۔سورہ انعام ۵: ''و لا اعلم الغیب'' الخ پر ان کا ایک مبسوط و مدلل حاشیہ رسول اکرمؐ کے معجزات اور ان کے دلائل پر بصیرت افروز ہے۔ وہ پندرہ سطور پر مشتمل ہے۔ ۳۔ابوطالب کی حمایت نبوی اور اسلام کے بارے میں اور حضرت خدیجہؓ کے اسلام و تعاون کے متعلق دو اضافی و تشریحی حواشی کافی بڑے ہیں۔ ۴۔مسجد قبا کی تعمیر میں کردار نبوی۔ ۵۔سہیل عامری کی گرفتاری پر حضرت سودہؓ کے کلمات کی تشریح و تعبیر کے دو حواشی جن میں سے ایک مرتب گرامی کا ہے۔ ۶۔غزوہ احد میں حضرت ام عمارہ نسیبہ بنت کعب مازنیہؓ کی جنگ جوئی۔ ۷۔مقوقس کے ارسال کردہ تحائف کی تفصیل۔ ۸۔حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی شہادت پر ان کے لقب جعفر طیار اور ذوالجناحین کی تشریح۔ ۹۔جنگ حنین میں اولین وہلہ میں ہزیمت کا مقصد اور معجزہ الٰہی کی تشریح۔

ان حواشی میں شاہ بانو نے اپنے ترجمہ اردو کی تحقیقی، تنقیدی اور تشریحی قدر و قیمت میں خاصا اضافہ کیا ہے جو فارسی ترجمہ میں نہیں کیا جاسکا ہے۔ اس امر میں کہ ترجمہ کے سلسلہ میں کسی بحث میں مترجم کو حاشیہ نگاری کا حق و اختیار ہے بھی یا نہیں بحث کی جاسکتی ہے اور اثبات و نفی میں جواب دیا جاسکتا ہے۔ بسا اوقات مترجم کا فرض بن جاتا ہے کہ وہ کسی بحث طلب یا غلط یا مبہم بیان متن مصنف پر حاشیہ نقد و استدراک ضرور لگائے کیونکہ کسی غلط و غیر واضح بات کی ترسیل اس کے ترجمہ سے ہوسکتی ہے اور وہ قارئین کو گمراہ کرسکتی ہے۔ سیرت نبوی میں تو اس کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے۔ بہرحال اردو ترجمہ نویس نے اپنی ذمہ داری سمجھ کر ہی ان حواشی کو لگانے کا اہتمام کیا اور ترجمہ و تحقیق اور تنقید کے لحاظ سے وہ بہرحال قابل قدر ہے۔

عربی متن کے تسامحات و اغلاط: مصنف تاریخ بدء الاسلام نے اپنے اس رسالہ سیرت میں مختلف مباحث میں غلط روایات قبول کی ہیں اور متعدد واقعاتی اغلاط کا ارتکاب کیا ہے۔ ان کے علاوہ وہ ان روایت ضعیفہ کو بھی قبول کرتے ہیں جو سندی اور متنی تحقیق و تنقید دونوں کے لحاظ سے موضوع ہیں۔ ان میں سے کئی واقعات و روایات سیرت کی اپنی آخری تصنیف سیرۃ النبی میں تصحیح کی ہے اور مرجوح

روایات کی جگہ راجح روایات کو جگہ دی ہے، متعدد غلط روایات اور مرجوح واقعات کا ذکر اولین رسالہ سیرت سے آخری شاہکار سیرت تک دراز ہے۔ غالباً وہ ان کی فکری تاثیر کا نتیجہ ہے۔ مترجم فارسی نے تو اس سے تعرض نہیں کیا لیکن اردو ترجمہ کرنے والی شاہ بانو نے ان میں سے بعض بعض کی تصحیح اپنے حواشی میں کی ہے۔ مرتب متون ثلاثہ نے بھی ان غلط روایات یا واقعاتی اغلاط کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا جب کہ اردو ترجمہ میں متعدد کی تصحیح کی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد ماجد کے انتقال کا زمانہ مرجوح روایات کے مطابق ولادت نبوی کے دو ماہ بعد رسالہ بدء الاسلام میں متعین کیا گیا جب کہ صحیح و راجح روایات میں وہ ولادت مبارکہ سے دو ماہ قبل کا واقعہ ہے۔ اس پر اردو مترجم کا حاشیہ بصیرت افروز ہے اور یہی سیرۃ النبی میں آیا ہے۔

حضرت خدیجہ بنت خویلد اسدیؓ سے نکاح نبوی کے وقت ان کے والد خویلد بن اسد مر چکے تھے اور نکاح ان کے چچا عمرو بن خویلد نے کیا تھا۔ سیرۃ النبی میں شبلی نے ولی نکاح عمرو بن خویلد ہی کو مانا اور والد کے انتقال پر واقعاتی دلائل دیے ہیں۔ اول الذکر کو غلط قرار دیا ہے۔

ابتدائے دعوت نبوی کے اہم باب میں شبلی نے رسالہ بدء الاسلام اور سیرۃ النبی دونوں میں اپنے عزیزوں کے لیے دعوت طعام کا انتظام کرنے کا ذمہ حضرت علیؓ کے سر ڈالا ہے اور جامع سیرۃ النبی نے اس روایت پسندیدہ پر سخت نقد کر کے وجوہ وضع کا پتہ لگایا ہے۔ رسالہ سیرت میں خاندان بنی عبدالمطلب / بنی عبد مناف کی جگہ ''بنی المطلب'' موجود ہے اور وہی ترجمہ فارسی و اردو میں موجود ہے جو قطعی غلط ہے۔ البتہ آگے حضرت بلال حبشیؓ پر ظلم کرنے والے شیخ قریش کا نام متن میں ''امیہ بن ابی خلف'' چھپ گیا تھا اور اس کی تصحیح مرتب نے کی: ''امیہ بن خلف'' حالانکہ آگے ایک اور بحث میں صحیح نام متن عربی میں موجود ہے۔ ایسا دو مقامات پر ملتا ہے اور لگتا ہے کہ ابی اور خلف دونوں کا طباعتی اتصال طباعت کا کارنامہ ہے۔

اسلام عمرؓ کے مبحث میں بیشتر سیرت نگاروں نے ابن اسحاق کی روایت قبول کی ہے اور حضرت عمرؓ کی قتل نبوی سے توجہ مبذول کرانے کے لیے ان کے بہنوئی و چچازاد بھائی: ''ختنک و ابن عمک سعید بن زید اور بہن: اختک فاطمۃ بن الخطاب'' کی تصریح کی ہے۔ متن شبلی میں صرف بہنوئی والا رشتہ مذکور ہے اور ان کا نام نامی اور بہن اور ان کا اسم گرامی کسی وجہ سے رہ گیا اور

اس کی طرف کسی نے اشارہ نہ کیا سوائے اردو ترجمہ نویس کے جنھوں نے نہ صرف بہنوئی بلکہ بہن کے قبول اسلام کا ذکر کیا اور حاشیہ میں ان کے اسمائے گرامی کی بھی تصریح کی۔

مدینہ کی طرف ہجرت صحابہ کے بعد شبلی نے رسول اکرمؐ کے ساتھ صرف حضرات ابوبکرؓ و علیؓ کے رہ جانے کا ذکر کیا ہے۔ وہ قطعی صحیح نہیں، صحابہ کرام کی ایک خاصی تعداد مکہ مکرمہ میں اس وقت بھی تھی اور آپ کی ہجرت مدینہ کے بعد بھی موجود رہی تھی۔ ان میں سے کچھ مجبوری میں باقی رہ گئے اور متعدد کو قریش نے ان کے رفاہی کام کے سبب خوشی سے اپنے پاس رکھا تھا۔

شبلی نے اپنے رسالہ سیرت میں حضرت وحشی بن حرب حبشیؓ کو جبیر بن مطعم بن عدیؓ کا غلام بتا کر ان کو عم نبوی حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے قتل پر جنگ احد میں مامور کیا تھا کہ وہ ان کے چچا طعیمہ بن عدی کا بدلہ لیں جو غزوہ بدر میں حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یہ صحیح ترین روایت ہے لیکن سیرت النبی میں شبلی نے دوسرا موقف اختیار کیا ہے جو ارتقائے معکوس کی ضمن میں آتا ہے۔ وہ روایات سیرت سے متاثر ہوکر اور اموی عصبیت سے خم کھا کر حضرت ہند بنت عتبہ زوجہ حضرت ابوسفیان بن حرب امویؓ کی سازش کو حضرت وحشیؓ کے ہاتھوں حضرت حمزہؓ کا قتل دکھاتے ہیں یا ان پر الزام دھرتے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم وہ بیان شبلی ہے جس میں انھوں نے حضرت ہند بنت عتبہؓ پر اپنے شوہر ابوسفیانؓ کے اسلام لانے کی دعوت پر فتح مکہ میں قریش سے ان کے قتل کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور ان کی ریش پر دست درازی کرنے کا بھی الزام لگایا ہے۔ یہ روایت بھی بوجوہ منکر و موضوع ہے اور کسی فکری تاثیر کا شاخسانہ۔

جنگ احد میں شبلی نے باقی الصحابۃ کے ذمہ میدان جنگ میں جانے کا سہرا باندھا ہے اور اس کا فارسی ترجمہ ''برخی از صحابہ'' کیا گیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ پرجوش صحابہ خاص کر نوجوانان مدینہ جو بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے میدان جانے پر مصر تھے اور ان کی حمایت حضرت حمزہؓ جیسے اکابر نے کی تھی۔

غزوہ حمراء الاسد کا بیانیہ شبلی خاصا مبہم ہے اور اس نے یہ تاثر دیا ہے کہ کوئی اور لشکر و غنیم مکہ پر حملہ کے لیے آرہا تھا حالانکہ غزوہ احد والا لشکر ہی مراد ہے۔ جس کے پلٹ آنے اور مدینہ پر حملہ کرکے کلی استیصال کرنے سے خدشہ محسوس کرکے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے زخمی اور پریشان حال لشکر اسلامی کے

ساتھ اقدام فرمایا تھا۔

غزوہ خیبر میں حضرت علیؓ بلاشبہ ایک قلعہ۔قلعہ مرحب/قلعہ قموص کے فاتح تھے لیکن ان کو پورے خیبر کا فاتح قرار دینے کا عمومی جذبہ شبلی کے دل میں شیفتگی وعقیدت کی وجہ سے موجزن ہے۔ اصل فاتح خیبر سالار اعظم حضرت محمدؐ تھے اور قلعہ مرحب کی فتح میں حضرات شیخینؓ کے علاوہ متعدد دوسرے صحابہ کرام کا کردار بھی رہا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آخری معرکہ حضرت علیؓ کے ہاتھ رہا اور وہ بھی دعائے نبوی کا صلہ تھا۔ ایک دوسری روایت بھی ہے جو قتل مرحب کا سہرا ایک انصاری صحابی حضرت محمد بن مسلمہؓ کے سر باندھتی ہے۔ اسے محض واقدی روایت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ واقعاتی شہادت اس کو مستند بتاتی ہے۔

واقعات سیرت کے بیان میں مصنف گرامی کا غیر متوازن طریقہ بھی تسامح کے ذیل میں آتا ہے۔ وہ کئی غیر ضروری روایات کو بلاوجہ اہمیت دے کر شامل کرتے ہیں اور بہت ضروری اور سیرت نبوی کے رجحان ساز، آدم خیز، روح وجان پرور اور ناگزیر واقعات کا ایک دوسطری اختصار پیش کرتے ہیں یا نام ومعاملہ ترک کر کے نقص پیدا کر دیتے ہیں۔ ان سہ گونہ تسامحات کے علاوہ بعض بعض مباحث سے صرف نظر خاصا عجیب اور قابل نقد لگتا ہے۔ مرتب گرامی اور ناشر محترم نے اپنے مقدمہ و دیباچہ میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا ہے اور بعض کا ذکر خاکسار راقم کے مطالعہ کا عطیہ ہے۔ موزوں لگتا ہے کہ ان سب کا الگ الگ عنوان سے ذکر کر دیا جائے تا کہ تسامح صرف الزام نہ بن کر رہ جائے۔

معمولی یا غیر ضروری روایات کی تفصیل: حضرت ہند بن عتبہ عبشمی زوجہ حضرت ابوسفیان امویؓ کے بارے میں شبلی نے دو مقامات پر غیر ضروری تفصیل سے کام لیا ہے۔ وہ تحقیق ومبسوط نگارش میں تو مناسب تھی لیکن مختصر سیرت نویسی میں غیر مناسب ہے اور ان کی استنادی حیثیت سے بھی ان سے تعرض غیر ضروری تھا۔ ایک غزوہ احد میں حضرت حمزہؓ کی شہادت میں ان کے غیر انسانی فعل مثلہ اور درندگی کی روایت جو تمام سیرت نگاروں کا بڑا پسندیدہ موضوع ہے۔ دوم فتح مکہ میں بیعت کے وقت ان کے مکالمات اور طنزیہ بیانات اور حضرت ابوسفیان امویؓ کی قریش سے اسلامی بالادستی قبول کرنے کی التجا پر ان کی اپنے شوہر کے خلاف دریدہ دہنی اور اسلام کے خلاف قریش کو بھڑکانے کی اپنی حد تک کوشش۔ یہ دوسری روایت نئی اور تحقیق طلب بھی ہے۔

متعلقہ واقعہ میں کسر بیانی: اسلام حضرت عمرؓ کے ساتھ اسلام حضرت حمزہؓ کا ذکر لازمی طور سے مآخذ میں آتا ہے مگر رسالہ سیرت میں موخرالذکر کا حوالہ تک نہیں آیا۔ کئی معاملات و واقعات میں شبلی نے نام چھوڑ دیا یا ادھورا تذکرہ کیا جیسے سنہ ۸ھ میں اسلام حضرت خالد بن ولید و عمرو بن العاصؓ کا ذکر کیا مگر حضرت عثمان بن طلحہ عبدریؓ حاجب و کلید بردارِ کعبہ کا نام نامی ساقط کر دیا جب کہ مصادر کے مطابق تینوں نے ایک ساتھ سفر کرکے اسلام قبول کیا تھا۔ سنہ ۴ھ میں واقعات وغزوات کے دوران بدرالثانیہ کے ذکر کے بعد حضرت حسین بن علیؓ کا ایک قول کے مطابق تولد ہونے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے بڑے بھائی حضرت حسن بن علیؓ کی ولادت کا ذکر نہیں کیا، نہ پہلے اور نہ بعد میں حالانکہ ان کا ذکر ہر لحاظ سے زیادہ ضروری تھا۔ بعض دوسرے کمسن صحابہ کا ذکر بھی نظر انداز کیا۔

عظیم الشان واقعات کی تلخیص شدید: ۱۔ ان میں سب سے زیادہ حجۃ الوداع کے ایک اہم ترین واقعہ اور ارکان اسلام میں سے ایک عظیم الشان و محبوب ترین معاملہ کا اختصار باعث خلجان ہے۔ مصنف گرامی پر لازمی تھا کہ اس کا ذکر مناسب تفصیل سے کرتے اور اس کی ضروری چیزوں کو سامنے لاکر اس کی اہمیت واضح کرتے۔

۲۔ اسی طرح انہوں نے سنہ ۹ھ میں حج حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر اڑا دیا۔ حالانکہ وہ اسلامی ریاست مدینہ کا ایک بلکہ اولین امارت کا اہم معاملہ تھا۔

۳۔ ان میں سے غالباً سب سے زیادہ قصور و تسامح حجۃ الوداع میں رسول اکرمؐ کے خطبات عالیہ کے باب میں ملتا ہے کہ ان کا متن نہیں دیا اور صرف ایک جملہ/فقرہ میں خطبہ مشہورہ کا حوالہ دے دیا۔ وہ فتح مکہ کے خطبہ نبوی سے زیادہ معنی خیز خطبات نبوی تھے جن کو بالعموم ایک ہی خطبہ سمجھا جاتا ہے اور شبلی نے بھی اسے ایک ہی بتایا ہے۔ ان خطبات کا ایک اختصار و انتخاب رسالہ سیرت میں پیش کرنا ضروری کام تھا۔ مرتب گرامی نے اس خطبہ مشہورہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلا کر اس کے متن کو نقل نہ کرنے کا شکوہ کیا ہے۔

۴۔ کتاب (کاتبین)، عمال صدقات، امراء و لایات اور دوسرے تنظیمی اداروں و تقرریوں کا ذکر مختصر رہ گیا یا بہت زیادہ اختصار کا شکار ہو گیا۔

واقعات و معاملات سے قطعی اعراض: ۱۔ مرتب گرامی اور ناشر محترم دونوں کو اس کا احساس و

قلق ہے کہ شبلی نے سیرۃ النبی کی مانند اپنے اولین نقش سیرت میں ازواج مطہرات کا باب قطعی خارج کردیا۔ حضرت خدیجہؓ کا ذکر بیانیہ کے جبر سے آگیا اور دوسری ازواج مطہرات سے نکاح نبوی کے واقعات کو چھوڑ دیا حالانکہ ان میں سے متعدد سے آپ کا نکاح وازدواج بیشتر اسفار وغزوات کے ضمن میں ہوا تھا اور ان کو ان غزوات واسفار کے بیانیہ میں بہ آسانی بنا اور سمویا جاسکتا تھا۔

۲۔ سب سے زیادہ اہم تسامح یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ سے نکاح نبوی اور بعد میں رخصتی کا کوئی ذکر نہیں کیا جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے ازدواج کا ذکر کیا ہے خواہ وہ ایک جملہ میں رہا ہو۔ شاید ازواج مطہرات کے ذکر سے گریز کے سبب ہی۔

۳۔ رسول اکرمؐ کے آخری فرزند حضرت ابراہیمؑ کا جو ام المومنین حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے ذکر بھی رسالہ سیرت میں بار نہیں پاسکا۔

۴۔ اسی طرح سنہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء/ القضیہ کا ذکر نظر انداز کرنا غیر معقول بات نظر آتی ہے۔ وہ صلح حدیبیہ کی توسیع کا معاملہ بھی تھا اور ہجرت کے بعد رسول اکرمؐ اور آپ کے بیشتر صحابہ کرام بالخصوص مکی وقریشی اصحاب کی زیارت بیت اللہ اور دیدار وطن مالوف کا محبوب ترین معاملہ تھا۔

۵۔ سراپا کے ایک مختصر وجامع بیان کی کمی بھی اس رسالہ میں نظر آتی ہے۔ وہ ایک پیراگراف میں خاص خاص سراپا کا ذکر کرکے اس خلا کو پورا کرسکتے تھے۔

خاکسار راقم نے ایک عرصہ قبل مسلم یونیورسٹی کے موقر رسالہ فکر ونظر کے شبلی نمبر جون ۱۹۹۶ء میں ایک مبسوط مقالہ ''تالیف سیرت النبی۔ پس منظر وپیش کش'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس میں مولانا موصوف کے اس رسالہ سیرت سے بحث کی تھی۔ مصنف گرامی کا شروع سے خیال سیرت نبوی کی تالیف کا رہا تھا اور اس کا پہلا بیج رسالہ بدء الاسلام کی صورت میں پڑا اور سیرۃ النبی کی صورت میں وہ شجر طیبہ بنا۔ ان دونوں مختصر ومحقق تالیفات سیرت کے درمیانی عرصہ میں مصنف گرامی کے قلب وذہن میں سیرت نگاری کا جذبہ وفکر کس طرح کارفرما رہا اس سے یہاں بحث نہیں البتہ ان دونوں تالیفات سیرت کے حوالے سے شبلی کا فکری وفنی ارتقاء، سیرتی فہم وبصیرت اور نظریاتی صلابت وندرت کا ایک اشاریہ ضرور بیان کرتا ہے۔ رسالہ سیرت کے مباحث کے تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ میں ان کا ذکراذکار کسی نہ کسی طرح آتا رہا ہے لیکن بعض خاص نظریات شبلی کا ذکر کچھ تفصیل کے ساتھ اب اس خاص عنوان کے

تحت کیا جاتا ہے۔

۱۔قریب ترین اعزہ، رجال بنی عبدالمطلب/ بنی عبد مناف۔کی دعوت اسلام وطعام کی تنظیم کے لیے حضرت علیؓ کی ذمہ داری اور اسلام قبول کرنے اور رسول اکرمؐ کی حمایت ونصرت کرنے سے متعلق روایت شبلی کو بہت پسند تھی۔وہ رسالہ سیرت سے سیرۃ النبی تک جاری رہی۔اس کا ذکر اور اس پر نقد سلیمانی کی بحث کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔

۲۔شبلی نے سیرۃ النبی میں یہ موقف تمام مآخذ ومصادر اور محقق سیرت کے برعکس اختیار کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے قریشی کاروانِ تجارت کو روکنے کے لیے غزوۃ العشیرہ میں کوئی اقدام نہیں کیا تھا بلکہ قریشی مکی فوج کے اقدام کی خبر سن کر مدینہ منورہ سے قدم مبارک نکالا تھا۔یہ خیال ان کے قلب ودماغ میں شروع سے ان کے مطالعہ کی وجہ سے اور ان کی فکری ونظری صلابت کی بنا پر اتنا پیوست تھا کہ وہ رسالہ سیرت میں اول اول مختصر بیانیہ کی صورت میں اپنی شاہکار تصنیف سیرت کی تدوین سے بیس پچیس سال قبل ہویدا ہوا اور سیرۃ النبی میں دلائل سے مستند ہوا۔فکر ونظریہ شبلی سے اتفاق واختلاف اور اس پر نقد واستدراک دوسرا معاملہ ہے لیکن وہ شبلی کی فکری علمی صلابت اور ان کے فنی تدبر وتبحر کا طرہ امتیاز ہے۔

اختتامیہ: تمام تر مفصل تجزیاتی بحث ونقد کے باوجود دارالمصنّفین کے ناظم گرامی کا یہ کارنامہ تمام اہل علم وذوق کے شکریہ کا مستحق ہے۔انہوں نے بڑی کدوکاوش سے شبلی گرامی کے رسالہ تاریخ بدءالاسلام، اس کے فارسی ترجمہ فراہی اور موخرالذکر کے اردو ترجمہ شاہ بانو کو ایک جلد میں شائع کر کے ایک علمی خدمت انجام دی ہے اور شبلی صدی مطبوعات کی گراں قدری میں بڑا اضافہ کیا ہے اور نادر ونایاب کتابچوں کو محفوظ کیا ہے۔ان کا بیان اور دوسروں کا تجزیہ کسر بیانی اور تواضع وانکساری سے رسالہ سیرت شبلی کو ان کے بعد کے عظیم الشان علمی وتحقیقی کارناموں میں حقیر مقام دینے کی کوشش لگتا ہے۔ لیکن وہ حقیقت میں ایسا بے مایہ نہیں ہے۔اول تو کتب خانوں کے دفینوں سے ان تینوں کو برسرعام لانا اور ایک ساتھ اہل علم وذوق کے ہاتھوں میں پہونچانا ہی ایک قومی، علمی اور اسلامی خدمت ہے۔وہ صرف شبلی۔فراہی شناسی کی ایک رسمی اور محدود خدمت بھی نہیں جیسا کہ ناقدین سمجھ سکتے ہیں۔سیرت نگاری کے لحاظ سے شبلی کا رسالہ سیرت مختصر سیرت نگاری کے زمرے میں ایک بہت عمدہ اور کئی لحاظ سے وقیع تر

اضافہ وتکملہ ہے۔مشہورترین مختصرات محب طبری، ابن سیدالناس، ابوالفداء، وغیرہ سے موازنہ کرنے سے شبلی کے اس تدوینی وتالیفی کام کی قدروقیمت متعین ہوتی ہے، عام مختصرات سیرت کے بالمقابل شبلی کا رسالہ سیرت مسلسل تاریخی بیانیہ رکھتا ہے سوائے آخر کے چند مباحث کے جوفہرست نگاری کے زمرہ میں آتے ہیں۔ رسالت ودعوت کے مبحث میں شبلی نے جس طرح قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی آیات کریمہ کا دلآویز ودلنشیں وروح پرور انتخاب کیا ہے وہ ان کے قرآنی مطالعہ وتبحر اور کتاب اللہ اور رسول اللہؐ کے باہمی تعلق وتعامل کا نشان تو ہے ہی وہ توحید وآخرت ورسالت اور تعلیمات اسلام کا ایک بہت خوبصورت مرقع بھی ہے۔دعوت وتبلیغ کی کامیابی کے نتیجہ میں صحابہ کرام کی تعلیم وتربیت وتزکیہ اور مخالفین کی کوششوں کی سراسیمگی بھی اجاگر کرتا ہے۔نصابی ضرورت کے لیے اس کی تصنیف وتالیف اور مدرسۃ العلوم کے نصاب دینیات میں اس کی حصہ داری وکارفرمائی اور تاثیر تعلیم وتدریس کے علاوہ تربیت کے لحاظ سے بھی اس کی قدروقیمت بہت زیادہ ہے۔خواہ کسی بھی سطح پر عربی متن اور اس کا فارسی ترجمہ داخل نصاب رہا ہو اس نے نوخیز ذہنوں کو اسلامیانے کا عظیم الشان اور کثیر المقاصد کارنامہ انجام دیا تھا اور مسلسل دیتا رہا تھا۔شبلی اپنے قیام علی گڑھ کے ابتدائی زمانے سے ہی طلبہ واساتذہ اور کارکنان مدرسۃ العلوم کو کتاب اللہ اور سیرت رسولؐ سے جوڑنے کا کام کرتے رہے تھے۔ وہ ان کے قرآنی دروس اور سیرتی اجلاسوں کا ایک زبانی طریقہ تھا۔ رسالہ سیرت نے تفصیلی انداز سے ان کے ذوق مطالعہ اور شوق اسلام دونوں کے لیے سرمایہ۔اچوک وکارگر سرمایہ۔فراہم کیا تھا۔

رسالہ سیرت کا نام وعنوان بدءالاسلام کسی حد تک اس زمانے کے ماحول وفکر رسا کی وجہ سے رکھا گیا ہو لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت مسلمہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام اور سیرت نگار ومورخین وغیرہ کے ذہن وقلب میں یہ تصور خام بسا ہوا ہے کہ اسلام کا آغاز حضرت محمد رسولؐ کی بعثت ودعوت سے ہوا۔ چند محققین قدیم وجدید کے سوا تمام اسلامیان عالم اس غلط فہمی یا استشراقی جال میں پھنسے ہوئے ہیں حالانکہ علمائے کرام، ماہرین قرآن وحدیث اور محققین اسلام وسیرت سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا کہ اسلام واحد دین ربانی ہے اور وہ از حضرت آدم علیہ السلام تا حضرت فخر آدم صلی اللہ علیہ وسلم تک اپنی بنیادی حیثیت اور نہادی ہیئت میں ہمیشہ جاری رہا اور تمام انبیائے کرام اسلام کے رسول تھے اور فخر آدم ان کے خاتم وسید۔شبلی کے ذہن وقلب میں یہ خیال بھی شاید بسا رہا تھا کہ رسول اللہؐ کے اسوہ کاملہ اور

سیرت طیبہ کے ذریعہ قارئین، اسلام کا محسوس پیکر ملاحظہ کریں۔ سیرۃ النبی کی تالیفی خاکہ نگاری میں سیرت نبوی کے خاص مباحث کے علاوہ اسلام کے عقائد وارکان اور تعلیمات اور قرآن کریم کے مباحث کی شمولیت کے سبب کی توجیہ انھوں نے یہی کی تھی کہ مسلمانوں کو اپنے رسول اکرمؐ سے بے انتہا شیفتگی اور بیکراں محبت ہے اور وہ آپ کی وجہ سے اسلام کو بھی پڑھ لیں گے اور قرآن کو بھی سمجھ لیں گے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت، اسلام شناسی اور دینداری سب کو رسول اللہؐ کے واسطہ سے ہی تو ملی ہے۔ اس کے باوجود رسالہ سیرت کا نام بدءالاسلام/آغاز اسلام کے علاوہ کچھ اور رکھنا چاہیے تھا کہ وہ غلط فکر و گمراہ کن خیال تک لے جاتا ہے۔

آخر میں مرتب گرامی کے کام وکارکردگی کی تعریف وتحسین کے ساتھ تدوینی اور متنی تحقیق کے لحاظ سے چند معروضات بھی پیش کرنی ہیں۔ عربی متن اور فارسی وارد و تراجم کی تصحیح کے باب میں ان کی مساعی، جمیلہ بھی ہیں اور جلیلہ بھی لیکن وہ متوازن و یک رنگ اور تحقیقی وتدوینی یکسانیت نہیں رکھتیں۔ انہوں نے متن عربی میں بسا اوقات اندرون متن تصحیح کی ہے اور شبلی کی اغلاط وتسامحات کو بدل دیا ہے یا قوسین وغیرہ میں اضافات کر کے تصحیح کی ہے لیکن بہت سے مقامات پر متن میں تصحیح نہیں کی اور غلط کو غلط ہی رہنے دیا۔ اسی طرح حواشی میں متن کی غلطی ملتی ہے اور کبھی تصحیح۔ بہت سے مقامات پر ایسا ہے۔ فارسی ترجمہ اور اردو ترجمہ متون میں وہ تصحیحات بھی نہیں بار پاسکیں جو عربی متن میں انہوں نے کی ہیں۔ ان سب کی طرف تجزیاتی بحث میں اشارے کیے گئے ہیں۔ بطور اختتامی معروضہ یہ بھی التجا ہے کہ ان تنقیدی کلمات کو شخصی نقد وطعن نہ خیال فرمایا جائے کہ اکثر اہل علم طیش میں آکر خوف خدا بھول جاتے ہیں اور ناقد مصلح کے تعاقب میں لگ جاتے ہیں۔ سیرت نبوی کے تقدس وطہارت اور اس کے ذوق فراواں سے تحریک پا کر تعاقب کی بجائے اگلی طباعات میں ان معروضات کو ملاحظہ فرمائیں اور قابل عمل وصحت پائیں تو ان کو بروئے کار لائیں ورنہ اماماں علم وفقہ کے بقول معروضات خاکسار کو دیوار پر ماردیں۔

مجید حسن اور اخبار ''مدینہ'' بجنور

ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی

ہندوستان میں اردو صحافت کی ابتدا اگرچہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہوئی لیکن عوامی سطح پر مقبولیت حاصل کرنے میں اسے کم و بیش ۸۰ برس کا طویل سفر طے کرنا پڑا۔ ان ۸۰ برسوں میں چند اخبارات ایسے تھے جنہوں نے صحافت کی تاریخ میں گہرے نقوش مرتسم کیے مثلاً دہلی اردو اخبار، اودھ اخبار، پیسہ اخبار وغیرہ، مگر بیسویں صدی میں شائع ہونے والے اخبارات کے لحاظ سے ان کی اہمیت و حقیقت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ بیسویں صدی کا عہد تہذیبی، سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی، مذہبی اور تعلیمی اعتبار سے جس قدر انتشار و بے چینی کا تھا اسی قدر ادبی اور صحافتی اعتبار سے ترقی کا ثابت ہوا۔ ادبی منظرنامے سے قطع نظر بیسویں صدی کی پہلی دہائی ہی سے ایسے اخبارات شائع ہونے شروع ہو گئے تھے جنہوں نے صحافت کو ایک نیا رنگ و آہنگ اور اچھوتا اسلوب و انداز بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مولوی مجید حسن کا اخبار ''مدینہ'' بجنور اسی سلسلے کی ایک کامیاب کڑی تھا۔

اخبار ''مدینہ'' بجنور یکم مئی ۱۹۱۲ء کو صحافت کے افق پر نمودار ہوا۔ لیکن بعض محققین اس کی تاریخ اشاعت کے تعلق سے غلط فہمی کے شکار نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے ''پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ'' میں ۱۹۰۲ء اور عابد اللہ غازی نے ''صریر خامہ'' میں ۱۹۱۳ء رقم کیا ہے جو تحقیقی نقطۂ نگاہ سے درست نہیں۔ اخبار ''مدینہ'' بجنور کی تاریخ اشاعت اور اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولوی مجید حسن نے خود ہی اس نقطے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

> ''مدینہ یکم مئی ۱۹۱۲ء سے نکلا لیکن کئی مہینہ تک اس کی اشاعت کی رفتار
> اس قدر سست رہی کہ ہماری ہمت شکست ہونے لگی کیونکہ جو اندوختہ ہم نے مدۃ العمر

پروجیکٹ فیلو، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

کی بیرونی ملازمت میں جمع کیا تھا وہ اس پر تمام وکمال خرچ ہو چکا تھا۔ ہم نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی اور ایک معقول رقم قرض لے کر مدینہ کے کام کو محنت ومشقت سے انجام دینے لگے خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے ہماری محنت کو بار آور کیا اور ایک سال میں مدینہ اس قابل ہوگیا کہ اپنے مصارف برداشت کرنے لگا''۔(۱)

درج بالا اقتباس کے ذریعہ مولوی مجید حسن کی زبانی اس کا انکشاف کلی طور پر ہوجاتا ہے کہ اخبار ''مدینہ'' بجنور کا پہلا شمارہ یکم مئی ۱۹۱۲ء کو منظر عام پر آیا۔ ساتھ ہی اس اقتباس میں مالی مشکلات اور جدوجہد مسلسل کی طرف بھی واضح اشارے موجود ہیں۔ کیونکہ ایک شکستہ کشتی موجوں سے ٹکراتی ہوئی ساحل سے جا لگی اور پھر از سرنو اپنے سفر کا آغاز کیا۔ یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا، لیکن اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے مولوی مجید حسن نے اسے ہفتہ میں دوبار شائع کرنا شروع کردیا۔ حتی کہ انہوں نے روزنامہ کی طرف بھی پیش قدمی کی لیکن حالات موافق نہ ہونے کی وجہ سے یہ اخبار آخر تک سہ روزہ ہی رہا۔

اخبار ''مدینہ'' آخر تھا کیا؟ صرف ایک اردو اخبار، نہیں! جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسے فقط اخبار کہہ کر دامن جھاڑ لینا سراسر زیادتی اور ناانصافی کی بات ہے۔ بیسوی صدی کی دوسری دہائی سے لے کر آٹھویں دہائی تک شاید ہی کوئی ایسا پہلو یا موضوع نکل آئے جس کی طرف ''مدینہ'' نے توجہ نہ دی ہو۔ بلقانیوں کی بغاوت ہو یا ترکوں کی جنگ، پہلی جنگ عظیم کے وجوہات کی بات کی جائے یا اس سے ہونے والی تباہی کی، مسجد کانپور کا سانحہ ہو یا جلیان والا باغ کا دلدوز واقعہ، پرنس آف ویلز کی آمد ہو یا ہندوستان میں خلافت تحریک کا آغاز، کانگریس کی حمایت ہو یا مسلم لیگ کی مخالفت، مقاطع ریزولیشن کی بات کریں یا ہندوستان چھوڑو تحریک کی، اردو، ہندی کا جھگڑا ہو یا ہندو مسلم مسائل، رولٹ بل کا نفاذ ہو یا سائمن کمیشن کی رپورٹ پاکستان کا قیام ہو یا تقسیم کے نام پر ہونے والے فسادات کا ذکر غرض کہ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے موضوع کی طرف اس نے بھرپور توجہ کی۔ یہ اخبار ابتدا تا آخر تسلسل کے ساتھ جاری رہا بعض اسباب کی بنا پر کچھ شمارے وقت پر شائع نہ کیے جاسکے لیکن اس درمیان کی اہم خبریں اگلے شمارے میں ضرور پیش کردی جاتی تھیں۔ اس لحاظ سے اگر ہم دیکھیں تو ''مدینہ'' اس دور کی ایسی مکمل اور مبسوط تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے جس سے چشم پوشی کسی صورت ممکن نہیں۔

اخبار ''مدینہ'' بجنور کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ اس کے حلقۂ ادارت میں ابتدا تا آخر تقریباً اٹھائیس اصحاب قلم نے ادارتی فرائض بحسن و خوبی انجام دیے۔ ان میں آغا رفیق بلند شہری، حافظ نورالحسن ذہین، امین احسن اصلاحی، حامدالانصاری غازی، نصیرالحق دہلوی، ابواللیث اصلاحی، ابوسعید بزمی، قاضی عدیل عباسی، پروفیسر ضیاءالحسن فاروقی، حمید حسن فکر، نصراللہ خاں اور قدوس صہبائی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام حضرات فقط صحافت کے پیشے سے منسلک نہ تھے بلکہ اپنے عہد کے ممتاز انشاپرداز، نثر نگار اور شاعر بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اخبار ''مدینہ'' بجنور نے جہاں صحافتی اعتبار سے ملک و قوم کی بے شمار خدمات انجام دیں وہیں ادبی سرمائے میں بھی اضافے کا سبب بنا۔ اگر ہم اخبار ''مدینہ'' میں شائع ہونے والے فقط ادبی سرمائے کا جائزہ لیں تو اس کے لیے بھی ایک دفتر کی ضرورت درپیش ہوگی۔ ادبی سرمایہ کے حوالے سے اس کے لکھنے والوں میں اکبرالہ آبادی، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، شاد عظیم آبادی، نوح ناروی، ظفر علی خاں، جگر مرادآبادی، محمد علی جوہر، روش صدیقی، ساغر نظامی، عثمان فارقلیط، وارث کامل، محمد اجمل خاں وغیرہ کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔

جس زمانے میں یہ اخبار جاری ہوا اس وقت ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریز دشمنی اور ملک کی مکمل آزادی کا جذبہ کسی نہ کسی درجہ میں گھر کر چکا تھا۔ لوگ ذہنی اور قلبی طور پر اس کے خواہش مند تھے کہ ملک کو آزاد کرایا جائے لیکن شاید خواہش کے باوجود ملک کی آزادی کے لیے عوام کا خود کو اس کا اہل نہ سمجھنے کی ایک وجہ سرسید کی سیاست سے باز رہنے کی تلقین بھی تھی۔ اخبار ''مدینہ'' نے سرسید کے نظریے کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ جس زمانے میں سرسید نے یہ مشورہ دیا تھا اس وقت کے حالات اور مسائل کچھ اور تھے مگر آج صورت حال مختلف ہے۔ لہٰذا ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں برابر کے شریک ہوں۔

اخبار ''مدینہ'' کے ذریعہ کی گئی یہ اپیل صد فیصد درست تھی کہ ہندوستانی عوام آزادی وطن کی کوشش کریں، لیکن یہ کوشش جب ہی بارآور ثابت ہوسکتی تھی جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اخوت و ہمدردی اور اتحاد و اتفاق کی فضا قائم ہو۔ انگریزی حکومت اس حقیقت سے پوری طرح آشنا تھی کہ ہندوستان میں ان کا قیام اسی وقت تک ممکن ہے جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان

بغض وعناد کے عناصر موجود ہیں۔لہٰذا انہوں نے ایسے افراد کی تلاش شروع کردی جو چند سکوں کی خاطر اپنا ملک اور ضمیر دونوں بیچنے کے لیے تیار ہوں۔اس مقصد میں انگریزوں کو کامیابی ملی اور دیکھتے دیکھتے ہی سارا ہندوستان ان کے زیرنگیں چلا گیا ؎

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر لوٹ لی

انگریزوں کی اس حکمت عملی کا پردہ فاش کرنے اور ان کی حقیقی تصویر ابھارنے میں اردو اخبارات نے جس بے جگری اور بے خوفی کا مظاہرہ کیا اس کا اندازہ ان اخبارات کی بندشوں، قرقیوں اور ضبطیوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔حکومت ایک اخبار پر پابندی عائد کرتی تو اسی سے ملتے جلتے نام سے دوسرا اخبار جاری کردیا جاتا، پھر جب دوسرے پر پابندی لگائی جاتی تو وہی ادارہ کوئی تیسرا اخبار شائع کرتا مثلاً الہلال پر بندش لگی تو البلاغ جاری ہوا، ہفتہ وار ہند پر جرمانے عائد ہوئے تو الہند، ہند جدید، سہ روزہ ہند وغیرہ جاری ہوئے۔غرض کہ نام میں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ اخبارات شائع ہوتے رہے۔اردو صحافت کی اسی باغیانہ روش نے انگریزی حکومت کے ایوان کو متزلزل کررکھا تھا۔تھامس منرو جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے آرمی آفیسر کے عہدے پر مامور تھا، مشہور ہے کہ لبرل اور روشن خیال شخص تھا،لیکن ہندوستانی صحافت کے تعلق سے اس کے بیان کو پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اپنی حکومت کو برقرار اور ہندوستانیوں کو غلام بنائے رکھنے پر وہ کس قدر مصر تھا۔ ۱۸۲۲ء میں اپنی ایک تقریر کے دوران اس نے صحافت کی اہمیت اور ہندوستانیوں کو اس پیشہ سے دور رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا:

> ”ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں ان کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی گئی اور نہ کبھی دی جائے گی۔اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن ہوتی تو میں اخباروں کی انتہائی آزادی کو ترجیح دیتا لیکن چونکہ وہ ہماری ہم وطن نہیں ہے اس لیے اس سے زیادہ خطرناک اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ اخباروں کی آزادی اور اجنبیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جو نہ تو ایک جگہ جمع ہوسکتی ہیں اور نہ مل کر ایک ساتھ چل سکتی ہیں۔آزاد اخبار نویسی کا پہلا فرض کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ ملک کو بدیسی حکمرانوں سے نجات دلائی جائے۔اگر

یورپین اور ہندوستانی اخباروں کو آزادی دی گئی تو اس کا بھی نتیجہ یہی ہوگا''۔(۲)

درج بالا اقتباس میں دو باتوں کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی یہ کہ رعایا ہم وطن نہیں ہے اور دوسری اخباروں کی آزادی کا براہ راست اثر حکومت پر پڑے گا۔ یہی وجہ تھی دیسی زبان میں شائع ہونے والے تقریباً تمام اخبارات طویل مدت تک ملک وقوم کی خدمت انجام دینے کا فرض بہ آسانی ادا نہ کر سکے۔

اخبار ''مدینہ'' بجنور بھی اپنی بے باکی اور حق گوئی کی بنا پر انگریزی عتاب سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس پر اتنی سخت پابندیاں عائد کردی گئیں کہ اسے مجبوراً ''مدینہ'' کی بجائے ''یثرب'' کا روپ اختیار کرنا پڑا۔ (حاشیہ: اخبار ''مدینہ'' کا فقط صوبۂ پنجاب میں داخلہ ممنوع تھا اس کے علاوہ تمام ریاست میں اس پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقط ایک ریاست میں پابندی عائد کیے جانے پر اسے کیوں ''مدینہ'' سے ''یثرب'' میں تبدیل کر دیا گیا؟ واقعہ یہ ہے کہ اخبار ''مدینہ'' کے سب سے زیادہ خریدار پنجاب میں موجود تھے یعنی صوبۂ پنجاب پریس کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ مولوی مجید حسن کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ پنجاب کے لیے ''یثرب'' اور باقی اضلاع کے لیے ''مدینہ'' شائع کریں۔ لہٰذا انہیں مناسب معلوم ہوا کہ جب تک اخبار ''مدینہ'' کو پنجاب میں داخلے کی اجازت نہیں مل جاتی اسے ''یثرب'' کے نام ہی سے جاری رکھنا چاہیے)۔ اخبار ''مدینہ'' نے ''یثرب'' نام کے ساتھ ۲۵ /اگست ۱۹۱۹ء سے دوبارہ ملک وقوم کی خدمت کا سلسلہ جاری کیا۔ لیکن افسوس ابھی اس کے چند شمارے ہی منظر عام پر آئے تھے کہ ۱۳/ستمبر ۱۹۱۹ء کو دوبارہ اس کی نکیل کس دی گئی۔ مگر مولوی مجید حسن کہاں رکنے والے تھے ۱۷/ستمبر ۱۹۱۹ء کو دوبارہ ''مدینہ'' کے نام سے اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس تعلق سے اخبار ''مدینہ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''مدینہ پر اگر کوئی تین ہفتہ کی غیر حاضری کا اعتراض کرے تو ''مدینہ'' یہ جواب دے سکتا ہے کہ حضرات آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں حاضر تو برابر ہوتا رہا صرف فرق اتنا تھا کہ پہلے جس لباس میں آتا تھا اس پر مصلحتاً یثربی چوغا پہن لیا تھا۔ اب چونکہ اس مصلحت کی ضرورت نہیں رہی لہٰذا پھر اپنے اصلی لباس میں جلوہ گر ہوتا ہوں''۔(۳)

اخبار ''مدینہ'' اپنی پیدائش ہی سے کانگریسی طرز خیال کا حامی تھا، بلکہ اسے کٹر کانگریسی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے بارہا عوام کو اس کی تلقین کی کہ سب ایک جھنڈے یعنی کانگریس تلے جمع ہو کر انگریزوں کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ کیونکہ پورے ملک میں کانگریس ہی ایک ایسی جماعت ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں فرقوں کے لیے یکساں حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مسلم لیگ کے کارکنان نے یہ غوغا بلند کر رکھا تھا کہ کانگریس خالص ہندوؤں کی جماعت ہے جو مسلمانوں کے حق میں کبھی بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ اخبار ''مدینہ'' نے ہندوستانی مسلمانوں کو اس معاملہ میں غور و فکر سے کام لینے اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا:

> ''آخر مسلمان اپنے حقوق کی حفاظت کس طرح کریں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کانگریس کی شرکت اس وقت ہمارا ضروری فرض ہے اور ہم کانگریس کے بغیر ملک وقوم کے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتے لیکن کانگریس کی ملکی خدمات اگر اس وقت پسندیدہ سمجھی جا رہی ہیں تو ہمارے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ ہم خواہ مخواہ اس کی مخالفت کریں''۔(۴)

ایک طرف اس اخبار نے عوام کو کانگریس میں شمولیت کی دعوت دی۔ تو دوسری جانب وہ مسلم لیگ کے عقائد و نظریات پر طنز کے تیر بھی برساتا رہا۔ مثال کے طور پر یکم اپریل ۱۹۴۰ء میں ''مسلم لیگ'' کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی اس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ملاحظہ فرمائیں:

صدق دل سے حامی آزادی کامل بھی ہے — راہ آزادی میں مسلم لیگ تو حائل بھی ہے
کیا عجب جو قافلہ والے یہ پوچھیں خضر سے — قبلہ و کعبہ خیال دوری منزل بھی ہے؟
اک معما، اک دھوکا تیرا دستور العمل — اے زہے قسمت کہ اس سے گرمی محفل بھی ہے
جبر و استبداد سے جس شوخ کے نالاں ہے تو — اس کے در پر اپنے حق کے واسطے سائل بھی ہے
کچھ تجھے مزدور اور دہقاں سے بھی ہے واسطہ — دل سہی پہلو میں لیکن اس میں درد دل بھی ہے؟
آڑ میں مذہب کے کھیلے جا سیاست کے شکار — سب کے سب دیوانے ہیں کوئی یہاں عاقل بھی ہے
خواب دیکھے جا یوں ہی آزادی کامل کے تو — ملک کو برباد کر دے دشمنوں سے مل کے تو (۵)

ان اشعار میں طنز کی کاٹ کس نوعیت کی ہے قارئین خود محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ بات صد فیصد

درست ہے کہ مولوی مجید حسن کٹر کانگریسی تھے۔لیکن جب کبھی کانگریس نے اصول کی خلاف ورزی کی تو اخبار ''مدینہ'' اس پر تنقید کرنے سے بھی باز نہ رہا۔حصول آزادی کے دوران کئی ایسے مواقع آئے جس میں کانگریسی رہنماؤں نے ملک کی فضا کو بگاڑنے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے مختلف قسم کے حربے استعمال کیے مثلاً گاؤ کشی، اردو ہندی کا جھگڑا، عبادت گاہوں کے مسائل وغیرہ۔ان تمام موضوعات یا مسائل پر اخبار ''مدینہ'' نے بے لاگ تنقید کی اور ان مباحث کے زیر اثر پیدا ہونے والے علل ونتائج سے عوام کو متنبہ کیا۔مثال کے طور پر جب ہندوؤں کی طرف سے گاؤ کشی کے مسئلہ پر ہنگامہ آرائی کا سلسلہ شروع ہوا اور اسے مذہب کے ساتھ سیاست سے بھی جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی جانے لگی تو اخبار ''مدینہ'' نے اپنے صفحات کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی سعی کی کہ مسلمانوں نے گائے خوری کا رواج نہ ہندوستان آنے کے بعد شروع کیا نہ ہندوؤں کے جذبات کو مجروح کرنے کی غرض سے اسے جاری رکھا۔ملاحظہ فرمائیں:

> ''جب سے ہندوستان میں مسلمان آئے ہیں اس وقت سے برابر اس شعار مذہبی (یعنی گائے کی قربانی پر) پر عمل ہوتا رہا ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس شعار مذہبی میں کوئی جدت نہیں کی اور نہ ان کا یہ منشا ہے کہ اس سے ہندو قوم کے جذبات کو نقصان پہنچایا جائے یا اس سے ان کی دل آزاری ہو''۔(۶)

اسی طرح اردو ہندی کے مسئلہ پر جب کانگریس کے ایک باوقار لیڈر مسٹر سمپورنا نند جو اس زمانے (۱۹۳۷۔۱۹۳۸) میں وزیر تعلیم کے عہدے پر فائز تھے، نے ہندوستانی زبان کے سائے تلے فقط ہندی کی ترقی یا اسے لنگوا فرینکا ثابت کرنے کی کوشش کی تو اخبار ''مدینہ'' نے نہ صرف مسٹر سمپورنا نند کے غلط نظریے کی تردید کی بلکہ اس کی وضاحت بھی کلی طور پر کردی کہ ہندوستان میں اگر کسی زبان کو لنگوا فرینکا کا درجہ دیا جاسکتا ہے تو وہ فقط اردو ہے۔اخبار ''مدینہ'' نے موسیو گریسن ڈی ٹی سی کے خطبہ کا ایک اقتباس نقل کیا:

> ''اردو نے ہندوستان میں وہی مرتبہ حاصل کیا ہے جو فرانسیسی زبان نے یورپ میں۔ یہ زبان وہ زبان ہے جو بکثرت استعمال میں رہتی ہے۔ یہ

عدالت اور شہروں میں استعمال ہوتی ہے۔اہل علم اپنی تصنیفات اور شعرا اپنے
خیالات اسی میں نظم کرتے ہیں۔یورپین سے گفتگو کا وسیلہ بھی یہی زبان ہے۔
اردو ہندوستان کے ہر قصبے میں سمجھی جاتی ہے۔باوجود یہ کہ وہاں اور زبانیں بولی
جاتی ہوں''۔(۷)

اقتباس کے آخری جملے پر توجہ دیں تو پتا چلے گا کہ ہندوستان کے جس صوبے میں اردو بولی نہیں جاتی تھی وہاں سمجھی ضرور جاتی تھی۔لہٰذا جو زبان تقریباً پورے ملک میں سمجھی یا بولی جاتی ہو لنگوا فرینکا کی سند اس کے بالمقابل کسی دوسری زبان کو نہیں دی جاسکتی۔ہندوستان کی لنگوا فرینکا کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے اخبار ''مدینہ'' نے دوٹوک اور صاف لفظوں میں اس امر کی وضاحت کردی کہ ''اردو ہی ہندوستان کی لنگوا فرینکا ہے۔مگر اس بدقسمتی کا کوئی علاج نہیں کہ کوئی وزیر تعلیم اپنے اختیارات خصوصی کے ماتحت ہندی کو ہندوستانی کہہ دے''۔(۸)

اردو ہندی کے جھگڑے کے ساتھ یہ نکتہ بھی زیر بحث رہا کہ ہندوستانی سے مراد کون سی زبان ہے اردو یا ہندی؟ مسلمانوں نے ''اردو'' کو ہندوستانی کہا تو ہندوؤں نے ''ہندی'' کو۔بعض حضرات ایسے بھی تھے جن کے نزدیک ہندوستانی سے مراد ایسی زبان تھی جس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے الفاظ شامل ہوں اور جو فارسی و عربی رسم الخط کے علاوہ دیوناگری میں بھی لکھی جاتی ہو،لیکن جب گہرائی سے ان کے خیالات و نظریات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر بھی غیر جانب داری کا عنصر عنقا ہے۔ان باتوں سے قطع نظر انگریزوں کے دخول ہند اور فورٹ ولیم کالج کے قیام کی جانب اگر توجہ کی جائے تو اس مسئلہ کا ازالہ بھی کسی حد تک ہوجاتا ہے کہ ہندوستانی سے مراد کون سی زبان ہے؟ فورٹ ولیم سے شائع ہونے والی تمام کتابیں اردو میں تھیں جسے انگریزوں نے ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا۔یعنی اس بحث کے آغاز سے بہت پہلے ہی ''اردو'' ہندوستانی کے نام سے معروف ہوچکی تھی۔صاف ہے کہ اس مسئلہ کی بنیادی وجہ فقط سیاسی فوائد کا حصول تھا۔

اخبار ''مدینہ'' بجنور نے اپنے صفحات کے ذریعہ عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ کی۔اس اخبار نے عورتوں کے لیے غالباً ۲۲/اپریل ۱۹۱۳ء میں ''مدینۃ النسواں'' کے نام سے ایک عنوان قائم کیا تھا۔جس کے ذیل میں محترمات صحابیہؓ کے واقعات،جنگجو اور بہادر خواتین کے حالات،

لڑکیوں کی صحت و تعلیم سے متعلق لائحہ عمل، گھریلو اور ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کی تدابیر کے ساتھ احادیث اور ان کی تشریحات جس میں عورتوں کو موضوع بنایا گیا ہو، پیش کی جاتی تھی۔ غرض کہ اس باب کے ذریعہ عورتوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کی حتی الوسع کوشش کی گئی۔

صحافتی خدمات کے ساتھ اخبار ''مدینہ'' نے ادب کی بھی بیش بہا خدمات انجام دی۔ ابتدا کے چار پانچ سال تک یہ سیاسی خبروں میں الجھا رہا لیکن ۱۹۱۸ء سے اس نے اپنا سرورق شعری حصہ کے لیے مختص کر دیا اور تقریباً یہ سلسلہ ۱۹۷۴ء تک مسلسل جاری رہا۔ اگرچہ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مہینوں تک اس اخبار میں کوئی غزل یا نظم شائع نہ ہوئی لیکن آہستہ آہستہ اس نے اپنی بنائی ہوئی راہ پر مستعدی کے ساتھ قدم بڑھایا۔ یعنی اس کے سرورق پر پھر سے نظمیں، غزلیں، رباعیات، قطعات، مخمسات وغیرہ شائع ہونے لگیں۔ علاوہ ازیں اس اخبار میں کتابوں پر تبصرے یا تبصراتی مضامین، نامور شخصیات کے خطوط، شعرا و ادبا یا قوم کے رہنماؤں کی موت پر تعزیتی مضامین، نئے اخبارات، رسائل اور کتابوں پر اشتہارات وغیرہ بھی اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے تھے۔

اخبار ''مدینہ'' بجنور کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس نے ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے پہلے ہی ایسے ادبی مضامین پیش کیے جن میں ترقی پسند عناصر بدرجہ اتم موجود تھے۔ نوجوانوں کو سرگرم عمل بنانے کی خواہش، مظالم کے خلاف کمربستہ ہونے کی تلقین، اپنے حقوق کی خاطر آواز بلند کرنے کا حوصلہ یہ سب ان نظموں میں پیش کیا گیا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کدھر ہوا ے قوم کے جوانو! دکھاؤ کچھ جوش نوجوانی	بنو بھی گرم عمل کہیں تم بہت ہوا دعویٰ زبانی
بغیر خون جگر فغاں میں ذرا بھی رنگ اثر نہ ہوگا	مجھے یہ ڈر ہے کہ ہو نہ جائے خروش دل صرف لن ترانی
اٹھو! اٹھو! قوم کے جوانو کہیں یہ بیمار مر نہ جائے	ذبیح راہ خدا بنو تم، فدا کرو اپنی زندگانی

اس طرح کی چند نظمیں ترقی پسند تحریک سے پہلے شائع ہو چکی تھیں، لیکن ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا کے ساتھ ہی اس نے جس تسلسل سے ان خیالات کی پیروی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس اخبار سے اگر ایسی نظموں یا غزلوں کا انتخاب کیا جائے جس میں ترقی پسند خیالات مضمر ہیں تو ایک طویل فہرست تیار کی جا سکتی ہے۔

اخبار ''مدینہ'' بجنور میں ''سر راہے'' کے عنوان سے ایک طنزیہ و مزاحیہ کالم بھی پیش کیا جاتا

تھا۔اس کالم کی شروعات قاضی بدرالحسن جلالی کے زمانۂ ادارت (اگست ۱۹۲۲ء تا جنوری ۱۹۲۸ء) میں ہوئی۔ یہ کالم تقریباً چالیس سال تک اس اخبار کی زینت رہا۔

آخر میں اس کی زبان و بیان کے متعلق بھی کچھ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔اخبار ''مدینہ'' نے اپنے موقف کے اظہار کے لیے جس طرح کی زبان کا استعمال روا رکھا وہ نہایت ہی سلیس، عام فہم اور سادہ تھی۔ابتدا سے آخر تک کئی مدیروں کے ہاتھوں میں پرچہ رہنے کے باوجود زبان و بیان کے تعلق سے اس میں کسی حد تک ایک قسم کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔بڑی سے بڑی خبر کو اس نے نہایت ہی آسان لفظوں میں یوں بیان کیا کہ جیسے سارا منظر سامنے کا ہو۔مثال کے طور پر جب مچھلی بازار مسجد کانپور کا حادثہ رونما ہوا تو اس کی خبریں ملک کے تقریباً تمام اخبارات میں شایع ہوئیں۔اب آیئے ہم یہاں یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس خبر کو''مدینہ'' بجنور اور ''الہلال'' نے کس انداز سے پیش کیا۔دونوں اخبارات نے اس خبر کی شروعات شعر سے کی مثلاً ''الہلال'' نے اپنے درد و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن　　بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا!

کس منھ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز؟　　اے روسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا! (۹)

اب ''مدینہ'' کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

جی بھر آیا سننے والوں کا، جگر شق ہوگئے　　کچھ عجب حسرت بھری تھی داستان اہل درد (۱۰)

مندرجہ بالا دونوں اشعار میں درد و غم پورے آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ ''الہلال'' نے طنز کا سہارا لے کر اصل ذمہ دار مسلمانان ہند بالخصوص مسلمانان کانپور کو ٹھہرایا ہے، جب کہ ''مدینہ'' نے اپنے شعر کے ذریعہ امت مسلمہ کے درد و غم کی بھرپور عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔دوسری بات تشبیہات و استعارات یا آرائشی زبان ہے جو''الہلال'' کا خاصہ تھی ان اشعار میں بھی موجود ہے۔اس کے برعکس ''مدینہ'' نے جس شعر کا انتخاب کیا وہ بالکل صاف، سادہ اور سلیس زبان میں ہے،لیکن درد سے معمور۔

مختصر یہ کہ اخبار ''مدینہ'' بجنور نے اپنے زمانے کے تقریباً تمام مسائل میں بھرپور حصہ لیا۔ اس نے اپنے نظریات و خیالات کی عکاسی کے لیے کبھی سیدھی سادی زبان تو کبھی طنز و مزاح کا انداز

اختیار کر کے بات عوام تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ادبی اعتبار سے بھی اس اخبار نے گراں بہا خدمات انجام دی۔ "مدینہ" بجنور میں پیش کی جانے والی تحریریں کبھی ادب برائے ادب کا منظر پیش کرتی تھیں تو کبھی ادب برائے زندگی کا۔ بالفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جہاں خالص ادبی نظریے کو فروغ دیا وہیں ادب میں رونما ہونے والی تحریکات اور رجحانات کی پذیرائی بھی کی۔ سیاسی مسائل ہوں یا سماجی، ادبی ہوں یا معاشی وغیرہ اس نے کبھی اپنے نظریات عوام پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو پیش کرتے ہوئے فیصلہ خود ان پر چھوڑ دیا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اخبار "مدینہ" کی خدمات بہ نسبت اس کے ہم عصروں کے قدرے زیادہ تھیں۔ لیکن افسوس موجودہ دور میں ہم "زمیندار"، "الہلال"، "ہمدرد" وغیرہ کی خدمات کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن "مدینہ" کی یاد بھی ہمارے ذہن و دل میں نہیں رہی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اخبار "مدینہ" کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی اہمیت و حقیقت کو موضوع تحقیق بنایا جائے۔

حواشی

(۱) اخبار "مدینہ"، مدینہ کے مستقبل پر ہمارے ارادے، ۱۵/تا ۲۲/ستمبر ۱۹۱۳ء، ص ۴، ج ۲، نمبر ۳۴۔ ۳۵۔ (۲) بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی، عتیق صدیقی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، پیش لفظ، ص ۵، دسمبر ۱۹۵۷ء۔ (۳) اخبار "مدینہ" بجنور، اتفاقیہ رخصت کا عذر، ۲۵/اگست ۱۹۱۹ء لغایت ۱۷/ستمبر ۱۹۱۹ء، ص ۱۔ (۴) اخبار "مدینہ" بجنور، شذرات: کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت، ۲۲/اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۵، ج ۲، نمبر ۳۹۔ (۵) اخبار "مدینہ"، بجنور، نظم "مسلم لیگ سے" از عبدالباری عاصیؔ، یکم اپریل ۱۹۴۰ء، ص ۱، ج ۲۹، نمبر ۲۳۔ (۶) اخبار "مدینہ"، بجنور، اداریہ: عیدالضحیٰ اور مسئلہ گاؤکشی، یکم نومبر ۱۹۱۳ء، ص ۳، ج ۲، نمبر ۴۰۔ (۷) مدینہ، بحث و نظر، مسئلہ زبان اور کانگریس کا حلقۂ اقتدار، ۲۸/اکتوبر ۱۹۳۸ء، ص ۳، ج ۲۷، نمبر ۷۸۔ (۸) ایضاً۔ (۹) الہلال، شذرات، ۹/جولائی ۱۹۱۳ء، ص ۲، ج ۳، نمبر ۲۔ (۱۰) اخبار "مدینہ" بجنور، مسلمانان ہند کے جذبات کا خداوندی امتحان، ۱۵/جولائی ۱۹۱۳ء، ص ۳، ج ۲، نمبر ۲۷۔

اردو زبان، تلفظ اور رسم الخط

ڈاکٹر خان محمد آصف

موجودہ عالمی منظر نامے میں ہمیں شور اور دھواں کے علاوہ کچھ سنائی اور دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ ہماری نسل اس دھوئیں کی کثافت اور شور کی سماعت سے فکری معذوریت کا شکار ہوتی جارہی ہے۔ کیونکہ شور سے سوچ اور فکر کی زمین بنجر ہوجاتی ہے۔ اور ہمارا داخلی اور خارجی مکالمہ بھی مجروح ہوتا ہے۔ جب ہم مکالمہ کرتے ہیں تو اپنے خیالات کو زبان کے وسیلے سے دوسرے تک پہونچاتے ہیں۔ کیونکہ افکار و نظریات زبان کے شہری ہوتے ہیں۔ لسانی شہریت سے بے وطنی کا مطلب ہے اپنے علمی و فکری اثاثے سے محروم ہوجانا۔ زبان لفظوں کا منبع ہوتی ہے۔ ہر لفظ اپنے اندر تاریخ اور تجربے کی تعبیر لیے ہوئے ہوتا ہے، جو خیالات کو پیکر عطا کرتا ہے، خوابوں کو تراشتا ہے اور انسانی زندگی کو معنویت اور مقصدیت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ جب کہ دھواں دہشت کی علامت ہے جو خواب کی تعبیر کو دھندلا کر دیتا ہے۔ کثافت شور کی تمام تر ذمہ داری ہم نئی نسل کے سر ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔ مرعوبیت کی مدہوشی میں غلطی تو ہم سے ہوئی ہے کہ ہم نے اپنے بچوں کو ان کی زبان اور ان کے علمی و فکری ورثے سے دور رکھا اور اپنے ہاتھوں اپنی تاریخ و تہذیب کو مسخ کیا اور ہزاروں سالوں کے فکری، تہذیبی، علمی اور لسانی ورثے سے منکر ہوگئے۔ ان قوموں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ ہم مانگے کے اجالے میں خوش ہیں، مستعار زبان اور خیال کو باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کی زبان سے ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' یا ''سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا'' یا ''مچھلی جل کی رانی ہے جیون اس کا پانی ہے'' کے بجائے "Twinkle Twinkel Little Star" اور "Baba Black Sheep" سننا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ ہم نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اس

فیکلٹی، شعبۂ اردو، گوتم بودھ یونیورسٹی، گریٹر نوئیڈا۔ (موبائل نمبر: 9650845746)

زبان کو ذریعہ بنایا، جو عالم نہیں بلکہ حاکم پیدا کرتی ہے۔ بچوں کا داخلہ ایسے اداروں میں کرایا جہاں اردو میں گفتگو کرنا گویا حرام ہو۔ ہم نے تو علم کو بھی ہندستانی طبقاتی نظام کے اصول پر حاکم اور محکوم میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہ انگریزی شناس طبقہ اپنے ساتھ ایک برآمد شدہ کانونیٹائی فکر لے کر آیا، انھوں نے علم کے موتی اور اپنے آباء واجداد کی مذہبی، ثقافتی میراث کو ردی میں تول دیا۔ ذکیہ مشہدی کا افسانہ "تھوڑا سا کاغذ" اسی قلبی اذیت کا اظہار ہے۔

> "ہاں انہیں ری سائیکل کیا جائے گا۔ ان لکھے سارے حروف مٹ جائیں گے۔ لگدی بن کا ان کا کاغذ بنے گا۔ کورا کاغذ، لیکن کیا کوئی تھوڑا سا کاغذ اردو لکھنے کے لیے بھی مانگے گا"۔(۱)

یہ ہمارے لیے کسی قومی المیہ سے کم نہیں کہ ہماری کانونٹیائی نسل اردو رسائل اور کتابوں کو محض کوڑا کرکٹ سے تعبیر کرتی ہے۔ جو علمی اثاثے کو سینت کے رکھنے اور بچانے کو غلاظت پر گھی سکھانے کے مترادف سمجھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو صرف اور صرف تعلیم دی گئی اور تربیت سے محروم رکھا گیا ہے۔ مجھے یہاں بڑی شدت سے سرسیدؒ یاد آرہے ہیں جن کی تمام تحریروں اور تقریروں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا لفظ ضرور ہوتا ہے۔ یہ تربیت ہمیں ہمارے تہذیبی ورثہ اور روایت سے منسلک رکھتی ہے۔ اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا وسیلہ بنتی ہے۔ اور اسی سے رواداری اور قوت برداشت پیدا ہوتی ہے۔ جسے آج مٹانے کی مسلسل کوشش کی جارہی ہے۔ اردو زبان ہماری شناخت اور ہمارے علم کی زبان ہے۔ اور ہمارے تہذیبی اثاثے کے لیے اردو زبان راس آتی ہے۔

اردو زبان کا نہ کوئی علاقہ ہے اور نہ ہی جغرافیائی سرحدیں یہ تو وابستگی اور وسیلے کی زبان ہے جس میں ترک اور تیاگ کا عنصر شامل ہے۔ اردو زبان اپنی پیدائش ہی سے لگاؤ کی زبان رہی ہے۔ اس کے خمیر میں کائناتی خاندان کا تصور ابتدا سے تھا یہی وجہ تھی کہ مغل، مرزا اور ترکوں نے اپنی زبان اور تہذیبی ورثے کو چھوڑ کر ایک ایسی زبان کا کو رواج دیا جو سب کی زبان ہو۔ جس میں پیار کے ساتھ سنسکار، سنگیت اور سنسکرتی سب کچھ موجود ہے۔ جس کے وسیلے سے ہر کوئی اپنے مافی الضمیر کو خوبصورتی سے ادا کر سکتا ہو، یہاں اردو کے نامور مستشرق پروفیسر ڈیوڈ میتھوز کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ انھوں نے وائس آف امریکہ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

''ایسے بھی غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا مجھے فطری لگاؤ ہے۔ مجھے ان دوستوں کے ساتھ رہتے ہوئے سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوا کہ یہ لوگ ہندستان اور پاکستان کے مختلف علاقوں کے تھے۔کوئی پنجابی،کوئی بنگالی،کوئی سندھی اور کوئی یوپی کا مگر یہ سب لوگ آپس میں ایک ہی زبان میں بات کرتے تھے ظاہر ہے یہ زبان اردو تھی''۔(۲)

اردو زبان کے سلسلے میں ڈیوڈ میتھوز کا یہ انکشاف اردو زبان کی عظمت اور معنویت کی بھرپور عکاسی کرتا ہیں۔لسانی،تہذیبی اور نظریاتی اختلاف کے باوجود اردو میں وہ مٹھاس ہے جو مکالمہ کا وسیلہ بننے پر مجبور کردیتی ہے۔اردو زبان کی اسی کشش اور جاذبیت نے اپنے شیدائیوں کے ساتھ ساتھ غیر روایتی محبان اردو کو بھی اپنے طلسم اور سحر میں قید کر رکھا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا کہ اردو ہمارے خاندان کی زبان ہے جس سے ہمارا رشتہ اجتماعی لاشعور کا ہے جس میں ہمارا صدیوں کا علمی اور فکری اثاثہ ہے۔اس زبان کو علم اور خیال کی زبان بنانے کے بجائے اطلاع کی زبان بنا کر بے توقیر کردیا گیا۔مرعوبیت میں ہم نے انگریزی زبان کو اپنالیا جس سے ہمارا اجتماعی شعور کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔مانگے کی اس زبان کے الفاظ وافکار کو ہم نے اخذ تو کرلیا لیکن ہضم نہ کرسکے اور ہماری حیثیت ڈال سے ٹوٹے ہوئے پتے کی کردی گئی،جو ہوا کے دوش پر کبھی ادھر تو کبھی ادھر ہوتا رہتا ہے۔جس کی کوئی جڑ نہیں ہوتی۔بقول انتظار حسین:

''سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی کہیں جڑیں ہوا کرتی ہیں۔وہ تو پانی پہ تیرتے ہیں''۔(۳)

اردو والوں کے ساتھ بھی یہی ہوا،انہوں نے چچا سام کی زبان کو قبول تو کرلیا لیکن سوچ سمندر میں کھمبوں کی طرح تیرتے رہے۔مانگے کی زبان اپنے ساتھ مانگے کے خیالات بھی لاتی ہے، جو بولنے والوں کے اندر مسرت نہیں مرعوبیت پیدا کرتی ہے۔خوف،الجھن،انتشار اور ٹکراؤ پیدا کرتی ہے۔اردو تو الجھاؤ کے بجائے سلجھاؤ اور ٹکراؤ کے بجائے لگاؤ کی زبان ہے۔یہ انسانوں کے درمیان فکری پل کا کام کرتی ہے۔اردو آج جس آشوب سے گزر رہی ہے،وہ خیال کی بے وطنی کا المیہ ہے۔آپ کسی زبان کو فکر وخیال سے الگ کردیجیے وہ خود بخود اپنی موت آپ مرجائے گی،کیونکہ زبان اپنے اندر

صدیوں کے تجربے کی تعبیر لیے ہوتی ہے اس کے الفاظ شوخیٔ تحریر کی علامت ہوتے ہیں، ہم نے اردو زبان کو علمی اور فکری ورثہ سے محروم کر دیا جو اردو کے لیے فکری خودکشی کے برابر ہے۔ اردو زبان کی بے حرمتی اردو معاشرے کی زوال آمادہ ذہنی کجی، فکری پسپائیت اور بے حوصلگی کا آئینہ ہے۔ اس کی مثال میں پاکستانی افسانہ نگار الطاف فاطمہ کے افسانہ ''دید اوید'' کے ایک اقتباس سے دینا چاہتا ہوں۔

> ''کیسی مضحکہ خیز صورت حال ہے کہ ہم دو ایشیائی مسلمان ایک دوسرے سے ایک تیسری زبان، ٹونی بلیئر کی زبان میں ہم کلام ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں ٹونی بلیئر کی زبان اور سوچ ہی سے متاثر ہو کر وہی کچھ کہنے لگوں۔ یہ آخری الفاظ میرے منہ سے بہ آواز نکلے تھے۔ وہ چونک کر بولی، کیوں! کیوں ہارون تم کسی اور کے زبان کے تابع ہو کر کیوں بولو۔ تم صحافی ہو۔ تمہاری تو اپنی سوچ اور اپنے تجربے ہونے چاہئیں''۔ (۴)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مانگے کی زبان اپنے ساتھ مانگے کی سوچ اور بیانیہ لے کر آتی ہے جو ہمارے وجود اور ہماری شناخت کو متاثر کرتی ہے ہر غور و فکر کرنے والے کو ایک زبان کی ضرورت ہوتی ہے جس کی تعبیر اس کے تہذیبی و لسانی تجربے سے ہوتی ہے اور تجربہ جب لفظی پیکر کا روپ لیتا ہے تو داستانی بیانیہ بنتا ہے اور جب دستاویز کی شکل اختیار کرتا ہے تو تاریخ بنتی ہے۔ ہم نے اپنے خود کے ہاتھوں سے اپنے آپ کو، اپنی زندگی کو، اپنی تاریخ کو مسخ کیا، ایسے میں ہم دوسرے کی زبان اور فکر کے تابع ہی رہیں گے ہماری کوئی سوچ یا تجربہ نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بغیر زبان کے سوچ آ ہی نہیں سکتی کیونکہ زبان خیال کا وطن ہوتی ہے۔ اپنی زبان کو مٹا دیجیے فکر و خیال خود بخود بے وطن ہو جائیں گے۔

آج ہماری نوجوان نسل اسی لئے فکری و تہذیبی گھٹن میں مبتلا ہے کہ وہ اپنے علمی و لسانی اثاثے کو بھول چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو گھن لگ گیا ہے۔ انگریزوں کی سگ پرستی سے ہمارے معاشرے کو جتنا نقصان نہیں اس سے کہیں زیادہ نقصان انگریزی سے مرعوبیت سے ہوا ہے۔ اگر ہم نے اطلاع کو علم میں منتقل کیا ہوتا تو آج اردو معاشرہ اپنی زبان کی بے توقیری کا نوحہ نہ کرتا۔ اردو معاشرے کی خرابی یہ ہے کہ اس نے اپنے اوپر احساس کمتری کی دبیز چادر اوڑھ رکھی ہے اور اپنے اردگرد ایک حصار بنا رکھا ہے اس سے باہر نکلنے کی ضرورت ہے۔ اب کوئی

آپ سے یاایھا المدثر کہنے والانہیں آئے گا۔آپ اردوزبان کوعلم کی زبان بنایئے آپ کے اظہار کی حیثیت مسلم ہوجائے گی۔اردوکوترقی یافتہ کرنے کی ضرورت ہےاس میں جوتبدیلیاں واقع ہورہی ہیں اس کو کھلے دل سے تسلیم کیجیے، کیونکہ کسی بھی زندہ معاشرےاورزبان کے لیے تبدیلی بہت ضروری ہوتی ہے جوایک فطری عمل ہے اگر تبدیلی نہ ہوتو زبانیں منجمد ہوجائیں گی یادوسرے لفظوں میں سنسکرت ہوجائیں گی، اگردوسری زبانوں کے الفاظ آرہے ہیں تو آنے دیجیےاس سے گھبرانے کی اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم ان نئے آنے والے الفاظ کواپنی ٹکسال میں ڈھال لیتے ہیں۔

ایک بات اورعرض کردوں کہ جولفظ دوسری زبانوں سے ہمارے ذخیرۂ فرہنگ میں آتا ہےوہ اپنے ساتھ اپنے معانی لے کرآتا ہے۔نیلوفر اقبال کے افسانہ'' آپریشن مائس'' سے میں ایک مثال پیش کرنا چاہتاہوں۔جس میں اردو کے ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ کواس خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ سماعت وسلاست میں کسی طرح کا رخنہ نہیں پڑتا۔ملاحظہ کریں:

> ''لیکن کلنگ مرسی۔ماس کلنگ۔نہیں مرسی تم جتنا بھی ہنسواس کا کوئی جواز نہیں۔آن ہیومن گراؤنڈز مرسی، وار کوکسی صورت صحیح نہیں کہا جا سکتا نہیں۔بہت بہت نفرت ہوگی۔''بہت کم کلنگ ہوگی۔سب ٹارگیٹ ہوگا۔ہمارے پاس ایسے بم ہیں جن سے ان کا ساراانفراسٹرکچر تباہ ہوجائے گا۔وہ غیر مسلح اوردہشت زدہ ہوجائیں گے۔بے بس ہوجائیں گے۔پھرہم ان کوری کنسٹرکٹ کریں گے۔وہ ہم سے نفرت نہیں کریں گے، اگر یہ بات تمہیں پریشان کررہی ہے۔''آریوشورمرسی''۔(۵)

گلزار صاحب کی نظم ہے'' یہ کیسا عشق ہے اردو زباں کا'' انھوں نے اپنی اس نظم میں انگریزی لفظ ارسٹوکریسی کوکس خوبصورتی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ملاحظہ کریں:

> بڑی ارسٹوکریسی ہے زباں میں
> فقیری میں نوابی کا مزہ دیتی ہے اردو
> اگرچہ معنی کم ہوتے ہیں اردو میں
> الفاظ کی افراط ہوتی ہے
> مگر پھر بھی بلند آواز پڑھیے تو بہت ہی معتبر لگتی ہے باتیں

کہیں کچھ دور سے کانوں میں پڑتی ہے اگر اردو
تو لگتا ہے کہ دن جاڑوں کے ہیں، کھڑکی کھلی ہے، دھوپ اندر آرہی ہے
عجب ہے یہ زبان اردو۔

تبدیلی فطری عمل ہے، اسی فطری عمل کے تحت زمانے اور زبانیں بھی تبدیل ہوتی ہیں اور یہ تبدیلی تعفن سے تازہ کاری کی سمت رہنمائی کرتی ہے۔ سماجی اور سائنسی اختراعات کے ساتھ اردو کی لفظیات اور اصطلاحات کے ذخیرے میں اضافہ ہوا اور ساتھ ہی اردو زبان کی فرہنگ میں کشادگی پیدا ہوئی۔ ایک بات اور میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عالم کاری اور سائبر سماج نے محض لسانی طور پر لوگوں کو مفلوج نہیں کیا بلکہ اس کی وجہ سے سماجی قدریں بھی شکست وریخت کا شکار ہوئیں۔ استعماری قوتیں تہذیبی اور لسانی یکسانیت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن اردو اس بچے کی زبان ہے جس کو مار رکھنے اور مر رکھنے کا ہنر آتا ہے۔ غزل کی طرح اردو بھی بڑی سخت جاں ہے وہ اپنی کشش اور جاذبیت سے اپنے عاشق صاق پیدا کر لیتی ہے۔ اردو میں دیگر زبانوں کے الفاظ میں اپنے مزاج کے اعتبار سے جذب اور انجذاب کی صلاحیت ہے۔ جس سے بول چال کے دوران ان الفاظ کی ادائیگی روڑہ نہیں بنتی۔ میں مثال کے لیے روزنامہ اخبار انقلاب دہلی کی کچھ سرخی پیش کرتا ہوں۔ ''بنگلور کے ریزارٹ پر چھاپہ، کانگریس کا سخت احتجاج''۔ ''پوزیشن کو ہراساں کرنے کی ہر ممکن کوشش''۔ ''سیشن شروع ہونے کے چار ماہ بعد بھی بچے نصابی کتب سے محروم''۔ اسی طرح ٹیلی ویژن پر بھی ہمارے نامہ نگار اردو کو انگریزی کے الفاظ کے ساتھ خبریں نشر کرتے ہیں۔ جیسے ڈسپلن شکنی کے الزام میں چھ سال کے لیے معطل کر دیا گیا ہے، ملتے ہیں ایک بریک کے بعد، اسی طرح تازہ نیوز کی جگہ، بریکنگ نیوز، ارکان، ممبران، جلسہ، ریلی، دفتر آفس، بدعنوانی، کرپشن، انتخاب، سلیکشن، قائد، پرفارمنس اور وقفہ کی جگہ بریک نے لے لی ہے۔ یہ اس طرح کے ہزاروں انگریزی کے الفاظ ہماری تقریر کے ساتھ ساتھ ہماری زبان کا بھی حصہ بن چکے ہیں جس کو تحریر اور تقریر میں برتتے وقت اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ اب انگریزی کے وہ تمام الفاظ ہمارے روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔

دنیا کی کسی زبان میں لہجہ کی یکسانیت کو تلاش کرنا پتھر پر پھول کھلانے جیسا ہے۔ ہم بھوج پوری بولنے والوں کے یہاں یہ کہاوت مشہور ہے کہ ایک کوس پر پانی بدلے، تین کوس پر وانی، ویسے بھی

ہم لوگوں کا شین، قاف درست نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابتدائی جماعت میں ہمارے استاذ نے حرفوں کی شناخت اور پہچان کے لیے جو میزان وضع کیا تھا وہ سیمیاتی وفونیاتی نہیں تھا جس سے ہم حروف کی ادائیگی صوتی اعتبار سے کرتے بلکہ ہماری پہچان کو حرف سے چھوٹے اور بڑے سے کرائی گئی۔ جیسا کہ یہ چھوٹی سین ہے اور یہ بڑی سین ہے کہیں شین کا ذکر نہیں تھا ایسا ہی قیاس آپ ''کاف'' اور ''قاف''، ''ز'' اور ''ژ''، ''ع'' اور ''غ'' پر کرلیں۔ یہی وجہ ہے کی ہم زمانے کو ''جمانے'' اور فسانہ کو ''پھسانے'' میں رہ گئے۔ ایسا ہی کچھ حال پنجابیوں کا ہے جو ''ق'' کو ''ک'' کہتے ہیں۔ علامہ اقبال جب تک باحیات تھے اپنے آپ کو ''اکبال'' ہی سمجھتے رہے یہی وجہ تھی کہ ان کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ''اقبال ہی اقبال'' سے آگاہ نہیں ہے، اس وجہ سے میرا یہ ماننا ہے کہ لہجے کے بدلنے سے اردو زبان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ اردو ہمیشہ سے کثرت کی زبان رہی ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ ''میں نے کھانا نہیں کھانا'' یا ''میں نے آپ کو دو روپے دینے ہیں''، تو ٹھیک ہے اس سے کیا حرج ہوتا ہے مافی الضمیر تو ادا ہوگیا۔ اگر ہم اس بات پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ بہار کے کچھ علاقے میں حرف ''ڑ'' کی آواز نہیں ہے جیسے عربی اور فارسی زبانوں میں ''ڈ، ڑ، ٹ'' کے حروف نہیں ہیں۔ وہ ڈاکٹر کو دکتور کہتے ہیں۔ اگر بہار کے لوگ ''ڑ'' کے بجائے ''ر'' اپنی بول چال میں استعمال کرتے ہیں تو کیا مضائقہ ہے جیسے ''سرک پر گھورا پراک پراک دورر ہا ہے''۔ ممبئی کے لوگوں کی گفتگو کا اپنا لب ولہجہ ہے وہ لوگ ''تجھ کو'' اور ''مجھ کو'' کی جگہ ''تیرے کو'' اور ''میرے کو'' اپنی بول چال میں کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اردو کے معروف شاعر وادیب ظفر اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس لفظ کو بڑی عمدگی سے برتا ہے ان کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

معلوم نہیں عشق کے سودے میں خسارہ
میرے کو زیادہ ہے کہ، تیرے کو زیادہ

اس نئی دنیا کا نیا انسان آدھا فیزیکل اور آدھا ڈیجیٹل ہے۔ ایسے میں زبانوں کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونا لازمی ہے۔ اور الفاظ کا حافظہ سے گم ہونا ایک فطری عمل ہے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی اردو زبان وادب مخالفت کے باوجود خلافت کر رہا ہے اس پر مستزاد یہ نجی ٹیلی ویژن چینل ہیں جو تلفظ اور تذکیر وتانیث کا غلط استعمال اس اعتماد سے کرتے ہیں کہ توبہ توبہ۔ عربی کا ایک مقولہ ہے

"جمال الانسان فی اللسان" کہ انسان کا جمال اس کی زبان میں ہے(۶)۔ جو ہم لفظ بولتے ہیں وہ ہمارے شعور اور شعار کی تعبیر ہوتا ہے۔ جس میں زندگی کی رمق، ضمیر کی توانائی اور تازگی کے ساتھ باطن کا حسن چھپا ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "لفظ کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔ لہٰذا آدمی کی مانند اس کا احترام بھی لازم ہے۔ لیکن خود غرضی کی جس فضا میں ہم سانس لے رہے ہیں اس کے باعث انصاف، اداروں اور قدروں کے ساتھ ساتھ لفظ بھی بے اعتبار رہوا۔ پہلے سیاست دانوں کے ہاتھوں، پھر ملاؤں کے ہاتھوں، پھر صحافیوں کے اور ادیبوں کے ہاتھوں"۔(۷)

ایک اور اقتباس:

> "کسی بھی معاشرے میں نئی نسل کے لیے اس معاشرے میں رائج زبان سیکھنے کے بہتر مواقع خاندان، اسکول اور اس کے بعد ٹی وی چینلوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے معاشرے میں اس حوالے سے خاندان اور تعلیمی ادارے کوئی واضح کردار ادا کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ جب کہ چینلوں نے نئی نسل کو اچھی اردو سننے کے مواقع دینے کے بجائے زبان کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً یہ دانستہ عمل نہیں ہے۔ بلکہ علم و ادب سے دوری کا ہے"۔(۸)

زبان کو حسی ترسیل و تفہیم کے ساتھ ساتھ انسانی تجربے سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ زبان اپنے اندرون میں تصور کائنات لیے ہوئی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا تعلق زمین سے زیادہ ہوتا ہے کتابوں سے اس کا تعلق محض حرف کی حرمت کو سند عطا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر "افراد زبان کے صارف بھی ہوتے ہیں اور وارث بھی"(۹) دنیا کی زیادہ تر زبانیں معدومیت کی طرف جارہی ہیں جس کے سبب ان زبانوں کا غلبہ بھی غیر مرئی طور پر ان کے بولنے اور سمجھنے والوں کے ہاتھوں سے سرکتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "ماہرین لسانیات نے اکیسویں صدی کو زبانوں کا قبرستان کہا ہے"(۱۰) زبانوں کے اس شہر خموشاں میں کچھ اردو نواز ہی "اردو نواز سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اردو نے نوازا ہے" جو اردو رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے کا دم بھرتے ہیں۔ جبکہ انہیں اس بات

کا بخوبی علم ہے کہ اردو زبان کی اپنی انفرادیت ہے اس کا اپنا لسانی اور صوتی نظام ہے۔لیکن میں ان سے بہت ہی مودبانہ یہ سوال ضرور پوچھنا چاہوں گا کہ اردو میں جو ایک صوتیہ حروف کے مجموعے ہیں، جیسے ''س، ث،ص'' اور ''ذ، ز، ژ، ظ،ض'' کو آپ دیونا گری خط میں کیسے لکھیں گے مثال کے طور پر زن، ظن، سفر اور صفر ان لفظوں کی معنوی تشریح کیسے ہوگی۔کیا دیونا گری یا رومن رسم الخط میں ان حروف کا کوئی متبادل لفظ ہے اگر ان کا جواب نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ان ترسیمی اصوات کو خارج از اردو زبان کر دینا چاہتے ہیں۔تیسری عالمی اردو کانفرنس میں ''بین الاقوامی سطح پر اردو رسم الخط کے مسئلے'' پر ہونے والے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ نے کہا تھا ''رسم الخط زبان کا لباس نہیں اس کی کھال ہوتا ہے۔بالکل ایسے ہی جیسے کسی انسان کے جسم پر کھال ہوتی ہے۔لباس تو تبدیل کیا جاتا ہے۔مسلسل تبدیل کیا جاتا ہے۔لیکن کسی کے جسم سے کھال اتار لی جائے۔یہ نا قابل تصور ہے۔ان کا کہنا تھا کہ یہ سیدھا سیدھا فاشزم ہے اور جو اردو کے لیے دیونا گری رسم الخط کی تجاویز پیش کرتے ہیں وہ کسی بھی طرح اردو کے خیر خواہ نہیں''۔(۱۱)

شمس الرحمٰن فاروقی اپنے ایک مضمون ''مجھے سب سے زیادہ چڑھ ان لوگوں سے ہے'' میں لکھتے ہیں۔''اردو دوستوں کا یہ گروہ دراصل اردو کا دشمن ہے۔کیونکہ اسی زبان کے بولنے میں احساس شکست اور احساس کمتری پیدا کرنا اور ساتھ ساتھ اس کی دوستی کا دم بھرنا،خاص کر ایسے دور میں جب اس پر پیغمبری وقت آ پڑا ہو اس کے ساتھ سراسر دشمنی اور ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ارے صاحب اس وقت ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اگر اردو کے رسم الخط اور املا سے آپ مطمئن نہ بھی ہوں تو خاموش رہیں تاکہ دشمنوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ دیکھیے ہم تو غیر ہیں،خود اردو کے اپنے اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں فلاں فلاں عیب ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر آپ اردو کے رسم الخط اور املا سے مطمئن ہیں تو بہ بانگ دہل اس اطمینان کا اظہار کریں۔اردو املا اور رسم الخط کی خوبیاں ظاہر کریں یا کم سے کم اتنا کریں کہ جس رسم الخط کو اردو کے مقابلہ میں بہتر بتایا جاتا ہے،اس کی خرابیاں اور کمیاں ظاہر کر دیں۔ایک صاحب نے فرمایا ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ آپ الفاظ کا تلفظ ظاہر کرنے کے لیے دیونا گری رسم الخط کا سہارا کیوں لیتے ہیں کیا اردو اس پر قادر نہیں ہے کہ تلفظ کو ظاہر کر سکے تو وہ خاموش ہو گئے،کیونکہ بات چبھتی ہوئی تھی میں پوچھتا ہوں کہ آپ خاموش کیوں ہوئے،اور کس طرح

فیصلہ کیا کہ بات چبھتی ہوئی تھی ٹھیک ہے اردو کا رسم الخط ناقص ہے۔کس زبان کا رسم الخط ناقص نہیں ہے رسم الخط کے بارے میں ارسطو یا ابن سینا نے کہا ہے کہ اسے کامل ہونا چاہیے اور دیوناگری رسم الخط میں کون سی ایسی خوبی ہے جو اردو میں نہیں ہے اگر زیر وزبر و پیش کا التزام کرلیں (جو غیر ضروری اور فضول ہے) تو دیوناگری کا جواب پیدا کرسکیں گے۔لیکن زیر وزبر و پیش کا التزام غیر ضروری ہے،اسی لیے تو اردو نے اسے ترک کیا۔اگر اردو میں دِل،دَل اور دُل کو الگ الگ طریقہ سے لکھا جائے تو اردو میں بھی ایسا ممکن ہے لیکن اردو والوں نے زیر وزبر و پیش کے اہتمام کو ترک کیا۔اس کے بجائے خوبصورتی اور مختصر نویسی کو اختیار کیا۔جس چیز کو ہم اردو والے ناپسند کرکے چھوڑ چکے ہیں اس کی خاطر آپ دیوناگری سے بہتر قرار دے رہے ہیں۔یہ کون سی عقل مندی اور کون سی اردو دوستی ہے۔

پھر سیکڑوں بلکہ ہزاروں لفظ ایسے ہیں جن کو دیوناگری رسم الخط ادا نہیں کرسکتا۔کچھ مثالیں اپنی زبان میں پیش کرچکا ہوں۔اردو میں آدھے زیر اور آدھے پیش والے ہزاروں لفظ ہیں،جن کو دیوناگری میں ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔وسطی ہمزہ والا کوئی لفظ دیوناگری کے بس کا نہیں۔یہاں تک کی ٹھیٹ پراکرت الفاظ مثلاً گئے،لیے،کئی،بیٹھے وغیرہ سینکڑوں الفاظ دیوناگری رسم الخط کی دسترس میں نہیں۔بعض حالات میں کچھ آواز اردو میں جس طرح ادا ہوتی ہے مثلاً احمد،تہ دار،مہتاب اس کی دیوناگری ادا کرنے سے قاصر ہے۔اردو یعنی کھڑی بولی کی آوازوں کے لیے دیوناگری بالکل ناکافی ہے۔اور کیوں نہ ہو،دیوناگری رسم الخط کھڑی بولی،یعنی اردو کے لیے بنا ہی نہیں ہے،لہٰذا خود ہندی زبان کے الفاظ اس رسم الخط میں مکمل طور پر ادا نہیں ہوسکے۔پھر دیوناگری والے کس بات پر نازاں ہیں اور اردو والے کس بات پر مجوب ہیں اور یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ رسم الخط حروف تہجی والے الفاظ کا تلفظ پوری طرح ظاہر کرنے کے لیے وجود میں آیا ہے یہ تو صرف ان زبانوں میں ممکن ہے جہاں تصویری نظام ہے اور حرف تہجی والا رسم الخط نہیں ہے۔اردو رسم الخط کی غیر قطعیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ زبان کی سینکڑوں آوازیں چند ہی علامتوں کے ذریعہ ادا ہوجاتی ہیں۔رسم الخط آوازوں کا نظام نہیں ہے،علامتوں کا نظام ہے"۔(۱۲)

شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ نے بڑی خوبصورتی سے رسم الخط کے مطالبات کو مسترد کیا اس کے ساتھ یہ بھی یقینی بنایا کہ جو لوگ اردو کے رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے کی وکالت

کرتے ہیں، دراصل وہ اردو دوست نہیں بلکہ اردو زبان و صحافت کے سب سے بڑے دشمن ہیں، انہیں اردو کے تہذیبی و لسانی اور علمی اثاثے سے کوئی مطلب نہیں، اور نہ وہ سہی معنوں میں اردو کے وارث ہیں۔ اگر ان کو اردو کا صارف کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اور یہ صارف اردو کے فکری اور ادبی ورثے کو دیوناگری میں تبدیل کر کے سائبر بازار میں دکان لگا کر بیٹھ گئے ہیں۔ اور اردو کی ڈیجیٹل منڈی میں اپنے مال کی منھ مانگی قیمت وصول کر رہے ہیں۔ مجھے ان سے کوئی شکوہ نہیں، خوشی تو اردو کی سخت جانی پر ہے کہ اس کی کونپل احتجاج کی زمین سے پھوٹی ہے اور اس نے مزاحمت کی گود میں پل کر چلنا سیکھا ہے۔ آج بھی اسی مزاحمت میں وہ زندہ ہے، اور سر چڑھ کر بول رہی ہے۔

مراجع

(۱) کہانی سے ملاقات، آصف اسلم فرخی، امروز علی گڑھ، کتابی سلسلہ (۲) اڈیٹر ابوالکلام قاسمی، اپریل ۲۰۱۷، ص ۱۶۔ (۲) قصہ شاہی ہندی کا: اردو زبان کے نامور مستشرق ڈیوڈ میتھوز کی زبانی، انٹرویو وائس آف امریکہ، اسد نذیر، عائشہ تنظیم۔ (۳) آگے سمندر ہے۔ انتظار حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ ص ۱۶۔ (۴) دیداوید، الطاف فاطمہ، نائن الیون اور پاکستانی اردو افسانہ منتخب افسانے، انتخاب و تجزیہ، نجیبہ عارف۔ پورب اکادمی، اسلام آباد، ص ۵۵۔ (۵) آپریشن مائس۔ نیلوفر اقبال، نائن الیون اور پاکستانی اردو افسانہ منتخب افسانے، انتخاب و تجزیہ، نجیبہ عارف۔ پورب اکادمی، اسلام آباد، ص ۱۲۷۔ (۶) اصلاح تلفظ و املا۔ چند تاثرات، پروفیسر تحسین فراقی، اصلاح تلفظ و املا۔ طالب ہاشمی، القمر انٹر پرائزز، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور، ص ۷۔ (۷) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے ۲۰۰۰ تک) ڈاکٹر سلیم اختر، کتابی دنیا دہلی، (نظر ثانی اور اضافی شدہ) ۲۰۰۰ء، ص ۶۷۳۔ (۸) میڈیا میں اردو زبان کا غلط استعمال۔ سید جعفر عسکری، ڈان نیوز، ۴/ اگست ۲۰۱۵ء۔ (۹) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے ۲۰۰۰ تک) ڈاکٹر سلیم اختر، کتابی دنیا دہلی، (نظر ثانی اور اضافی شدہ) ۲۰۰۰ء۔ (۱۰) اکیسویں صدی: زبانوں کا قبرستان از امیر حیدر بگورو، روزنامہ ماؤنٹین پاس، گلگت۔ (۱۱) اردو: امکان، مسائل امیدیں اور اندیشے۔ تیسری عالمی اردو کانفرنس ۲۰۰۶ء، لندن۔ بی بی سی اردو ڈاٹ کام، لندن۔ (۱۲) مجھے سب سے زیادہ چڑھ ان لوگوں سے ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، گوگل گروپ ڈاٹ کام۔ (۱۳) پروفیسر عارفہ زہرا سیدہ کے کراچی لٹریچر فیسٹول کے لکچر سے استفادہ کیا ہے۔

لفظ "ہندو" کی تاریخی، لغوی اور اصطلاحی حقیقت

ڈاکٹر مولانا محمد احمد نعیمی

ہندوستان کے قدیم مذہبی ادب اور مذہبی تاریخ میں ہندومت یا ہندو دھرم کا ہم معنی کوئی لفظ نہیں پایا جاتا ہے۔ وہاں پر سناتن دھرم اور ویدک دھرم الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ ویدوں اور اپنشدوں میں بیان کردہ سناتن دھرم اور ویدک دھرم کے مقام پر دور حاضر میں اب یہی ہندو دھرم مقبول و متعارف ہو گیا ہے۔ لیکن ہندو محققین و مفکرین کا آج بھی یہی ماننا ہے کہ حقیقت میں اس کا سناتن اور ویدک دھرم نام ہی زیادہ مناسب ہے۔ اس لیے کہ یہی اس کے اصل نام ہیں اور قدیم ہندوستانی مذہبی کتب میں انہیں اسماء کے ساتھ اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ جبکہ "ہندو" جدید لفظ ہے۔ سنسکرت کی لغات میں سوا شبد کلپدرم کے ہندو لفظ کہیں نہیں ملتا ہے اور شبد کلپدرم کی بنیاد میرو تنتر ہے جو قدیم ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں فارسی لغات میں ہندو لفظ ضرور ملتا ہے اور اس سے نکلے ہوئے مختلف الفاظ بھی جیسے ہندوستان، ہندسا، ہندی اور ہندو۔(۱) نیز ہندو علماء و محققین کہتے ہیں کہ جن جن سنسکرت گرنتھوں اور مذہبی کتابوں میں "ہندو" لفظ آیا ہوا نہیں بھی جدید ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ اگر یہ لفظ قدیم سنسکرت رہتا تو ویدوں میں نہ سہی، کم سے کم اسمرتیوں، پرانوں، رامائن، مہابھارت اور قدیم لغات (شبد کوش) میں ضرور پایا جاتا اور تو اور ہماری قدیم لغت (کوش گرنتھ)، امرکوش بھی اس ہندو لفظ سے پوری طرح ناواقف ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے قدیم مذہبی ادب میں تو ہندو لفظ کہیں آتا ہی نہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس لفظ کا حوالہ ہمیں جو کسی ہندوستانی کتاب میں ملتا ہے وہ آٹھویں صدی

لکچرر ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی۔

عیسوی کے ایک تانترک گرنتھ میں ہے، اور وہاں ہندو کا مطلب کسی خاص دھرم سے نہیں بلکہ خاص لوگوں سے ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ لفظ بہت قدیم ہے اور اویستا میں اور قدیم فارسی میں آتا ہے''۔(۲)

حقیقت یہ ہے کہ قدیم ہندوستانی لوگ اس لفظ سے نابلد تھے۔ سب سے پہلے اس کا استعمال قدیم ایرانیوں اور عربوں نے کیا اور وہ بھی صرف جغرافیائی یا ایک مخصوص قوم و آبادی کے ترجمان کی حیثیت سے (۳)۔ کیونکہ اہل علم و دانش کی اصطلاح میں ہندو بہ معنی ہندو مذہب کا پیروکار اور ہندومت یا ہندودھرم بہ معنی ایک خاص مذہب تو گیارہویں صدی عیسوی یا اس کے بعد کی ایجاد ہے۔ اس لیے کہ ابوالریحان محمد بن احمد البیرونی جن کا سنہ وفات ۱۳/دسمبر ۱۰۴۸ء ہے اور جو ہندودھرم کے معروف و مستند محقق و مورخ تسلیم کیے جاتے ہیں اور جن کی کتاب ''تحقیق ماللہند'' ہندودھرم کے حوالہ سے ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے انہوں نے اپنی اس شاہکار تصنیف میں ہندودھرم، ہندو مذہب، ہندومت یا ہندو بہ معنی ہندو مذہب کا ماننے والا (Follower) کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے، اکثر ہندو محققین و مفکرین بھی اسی طرف گئے ہیں۔ ہندی زبان کے مشہور قومی شاعر رام دھاری سنگھ دنکر لکھتے ہیں:

> ''ہندو لفظ ہمارے قدیم ادب میں نہیں ملتا ہے۔ بھارت ورش میں اس کا سب سے پہلا ذکر آٹھویں صدی عیسوی میں لکھے گئے ایک تنتر گرنتھ میں ہے۔ جہاں اس لفظ کا استعمال مذہبی معنی یا مذہبی اسم کے طور پر نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک گروہ یا ذات کے معنی میں کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر رادھا کمد مکھرجی کے مطابق بھارت کے باہر اس لفظ کا استعمال قدیم ترین اویستا اور ڈیریس ۵۲۲ تا ۴۸۶ قبل مسیح کے کتبوں میں موجود ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''ہندو'' لفظ غیر ملکی ہے اور سنسکرت اور پالی میں کہیں بھی اس کا استعمال نہیں ملتا۔ اس لفظ کی جو تاریخ ہے اس کے مطابق یہ کسی دھرم کا نام و ترجمان نہیں مانا جاسکتا بلکہ اس کا حقیقی معنی ہندوستان کا کوئی بھی باشندہ ہوسکتا ہے۔ بھارت ورش کا ہندو نام غیر ملکیوں کا دیا ہوا ہے یہ کئی حوالوں سے ثابت ہے۔ چنانچہ ساتویں صدی عیسوی میں اِتسنگ نامی ایک چینی سیاح بھارت ورش

آیا تھا، اس نے لکھا ہے کہ وسط ایشیا کے لوگ بھارت ورش کو ہندو کہتے ہیں۔
حالانکہ یہاں کے لوگ اپنے دیش کو آریا دیش کہتے ہیں''۔(۴)
مشہور ہندو محقق رجنی کانت شاستری لکھتے ہیں کہ:

''اگرچہ لفظ ہندو پارسیوں کی ہزاروں سال پہلے لکھی مذہبی کتاب ''شاتیر'' میں ملتا ہے جس میں ہمارے ملک کو ہند اور ہمیں ہندو کہہ کر پکارا گیا ہے۔ چنانچہ شاتیر میں مرقوم ہے: ''اکنوں برہمن ویاس نام از ہند آمد پس دانا کہ عقل چناں نیست''۔ (ویاس نامی ایک برہمن ہند سے آیا جس کے برابر کوئی دوسرا عقل مند نہیں)''۔

یقیناً یہ ویاس مہا بھارت اور اٹھارہ پرانوں کے قلم کار مہرشی کرشن دوے پاین وید ویاس ہی ہوں گے تبھی ان کی عقل مندی کو بے مثال کہا گیا ہے۔ اور اسی کتاب میں ''ہندی'' لفظ کا استعمال ''ہند والے کے معنی میں ہوا ہے۔ مثلاً:

چوں ویاس ہندی بلخ آمد
گشتا شپ زبردشت راو خواند

جب ہند والا ویاس بلخ میں آیا تو ایران کے بادشاہ گشتا شپ نے زبردشت کو بلایا۔ یہ زبردشت یا زرتشت پارسی دھرم کا بانی تھا۔ اس میں آگے لکھا ہے:

من مردے ام ہند نژاد، وہند باز بازگشت — یعنی میں ہند میں پیدا شدہ ایک مرد ہوں اور پھر وہ ہند کو لوٹ گیا۔(۵)

مختصر یہ کہ اس لفظ کی جو تاریخ ہے اس کے مطابق یہ کسی دھرم کا نام یا ترجمان نہیں مانا جاسکتا بلکہ اس کا حقیقی معنی و مفہوم ''ہندوستان کا کوئی بھی باشندہ یا بھارت کا کوئی بھی نواسی'' ہوسکتا ہے۔

لفظ ''ہندو'' کی لغوی و لفظی تحقیق و معنی: ہندو دھرم کا تحقیقی جایزہ لینے اور اس کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ ''ہندو'' لفظ کی اصل یا ماخذ اور اس کا معنی و مفہوم کیا ہے؟

اس سلسلے میں ہندو دھرم اور ہندوستان کی تاریخ سے متعلق مختلف کتابوں میں بہت سے حوالہ جات و اقوال موجود ہیں لیکن قریب قریب سب کا ماحصل ایک ہی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بھارت کا یہ نام غیر ملکیوں کا دیا ہوا ہے۔ چنانچہ ہندی کے مشہور قومی شاعر اپنی مایہ ناز تصنیف ''سنسکرتی

کے چارادھیائے‘‘میں لکھتے ہیں:

’’اصل میں بات یہ ہوئی کہ وسط ایشیا اور مغربی دنیا کے لوگ بھارت میں مغربی راستے سے آتے تھے، سندھوندی بھارت کی مغربی سرحد کے پاس پڑتی تھی اور اُدھر سے آنے والے لوگ اس ندی سے اس ملک کی پہچان کرتے تھے۔ان میں سے ایران اور ان کے پاس والے لوگ ’’سَا‘‘ کا صحیح تلفظ نہیں ادا کر سکنے کی وجہ سے ’’سندھو‘‘ کو ہندو کہنے لگے اور یونان والے لوگ ’’سَا‘‘ اور ’’دَ‘‘ کا صحیح تلفظ نہیں ادا کر سکنے کی وجہ سے ’’ہندوٗ‘‘ کو ’’اِنڈوٗ‘‘ کہنے لگے۔اس طرح بھارت کا نام ’’ہندو، ہندوستان اور انڈو، انڈیا چل پڑا‘‘۔(۶)

سوامی اننیانند تحریر کرتے ہیں:

’’ہندوٗ‘‘ لفظ ’’سندھوٗ‘‘ کا ہی بدلا ہوا روپ ہے۔سندھو ایک ندی کا نام ہے۔قدیم زمانے میں فارسی لوگ سندھوندی کے ساحلی لوگوں اور صوبوں (پردیش) کو ہندو کہا کرتے تھے۔اس کی وجہ غالباً سندھو کا صحیح تلفظ ادا نہ کر سکنے کی ان کے اندر اہلیت نہ ہونا تھی۔سندھو ہی ہندو بن گیا اور ان کا دھرم ہندو کہا جانے لگا‘‘۔(۷)

ویوگ ہری اپنی کتاب ہندودھرم میں رقم طراز ہیں:

’’ہمارے قریب جو مغربی بھارت ہوگا، وہی ایران والوں کے نزدیک ان کی مشرقی سرحد میں واقع بھارت ورش یا ہند ہوگا۔مشرقی حصے میں اہم دریا سندھو پڑتا ہے۔اسی عظیم دریا کے مغرب اور مشرق دونوں سمت چھ ندیاں اور جوڑ کر وہ سات ندیاں گنی جاتی ہیں، جنھیں پارسی نظم یا شاعری میں ہپت ہندو یا سپت سندھو کہا ہے۔قدیم پارسی ادب میں ہندو لفظ کا سب سے پرانا روپ یہی ملتا ہے۔اسی سات دریاؤں والے پردیش کو ہپت ہیندو بھی کہا گیا ہے۔پارسی زبان میں سوم کو ہوم سپت کو ہپت اور اسُر کو اہُر کہتے ہیں۔علم زبان ولسان کے مطابق ’’سَا‘‘ اور ’’ہا‘‘ آپس میں تبدیل ہوتے ہیں۔اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ پارسی دھرم کے تبلیغی عہد میں اس مشرقی صوبے کا نام ’’ھپت ھیند و یا صرف ھیندوٗ‘‘ تھا۔دھیرے دھیرے ھیند و کا

ہِندرہ گیااور یہاں کے رہنے والوں کا نام ہیندو سے ھیندو یا ہندو ہو گیا''۔(۸)

اس فکر و خیال کی تشریح و تصدیق ''تلک لوکمانّیے'' کے حسب ذیل اشلوک سے بھی بخوبی ہوتی ہے:

आसिंधो. सिन्धुपर्यन्ता यस्त भारत भूमिका।

पितृभू. पुण्य भूश्चेव स वै हिन्दु इतिस्मृत:।।

یعنی مغرب اور مشرق میں سمندر، جنوب میں سمندر اور شمال میں سندھو ندی کے مخرج (اُدْگم) تک ان چار سمتوں کے اندر جو ملک ہے وہی بھارت کی زمین (بھارت بھومی) ہے۔ یہ زمین جن کے آباءواجداد کی اور پاک زمین ہے وہی ہندو ہے۔(۹)

ہندو دھرم کے مشہور اسکالر رجنی کانت شاستری کی بھی یہی تحقیق ہے چنانچہ وہ اپنی شاہکار کتاب ''ہندو جاتی کا اُتّھان اور پتن'' میں بیان کرتے ہیں:

''بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ہند لفظ جو کہ غیر ملکیوں بالخصوص پارس والوں کے ذریعے اس ملک کا نام رکھا گیا ہے ''سندھو'' لفظ سے جو پنجاب کی ندی کا نام ہے نکلا ہے، پھر اسی ہند لفظ سے ہندو اور ہندی ان دونوں لفظوں کا اشتقاق ہوا۔ ہندلفظ سے پارس والوں کا مطلب سندھو ندی کے پار والے (پاروتی) ملک سے ہے۔ ہندو لفظ سے ہند کے باشندوں سے اور ہندی لفظ سے ہند کے باشندوں کی زبان سے تعلق مقصود تھا۔ پارس والے جہاں ہم سَ (سَا) بولتے ہیں وہاں اکثر ہَ (ہا) کا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے سپت ھفت، اسر اھر، سرسوتی ہر ہوتی اور سپت سندھو ھفت ہندو وغیرہ۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سندھو سے ہندو اور ہند سے ہندو اور ہندی یہ دو لفظ پیدا ہوئے''۔(۱۰)

شاستری جی چند سطور بعد مزید لکھتے ہیں:

''یونانی (Greeks) سندھو ندی کو اِنڈس (Indus) سندھو کے پار والے دیش کو انڈیا (India) اور وہاں کے رہنے والوں کو انڈینس (Indians) کہتے تھے۔ ہم نے بھی ان ناموں کو ان کے تعلق اور میل ملاپ میں آ کر اپنا لیا تھا۔ اور آج بھی ہم

یوروپین (Europian) کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے اپنا تعارف (Indian) کہہ کر ہی کراتے ہیں۔ٹھیک اسی طرح ہم نے پارس والوں کے ہند، ہندو اور ہندی لفظوں کو ان کے ساتھ قدیم زمانے میں اپنی قربت کے سبب اپنا لیا تھا''۔(۱۱)

سنسکرت اور ویدوں کے عظیم محقق و مفکر ڈاکٹر وید پرکاش اپادھیائے کی بھی یہی رائے ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''فارسی اور ایرانی لوگ سندھو ندی کے کنارے تک آتے تھے انہوں نے سندھو کے سکار کو ھکار میں بدل کر ہندو لفظ بنا دیا۔ اور استھان کو استان تلفظ کرکے ہندوستان اور وہاں کے رہنے والے لوگوں کو ہندو کہنے لگے۔ انہیں لوگوں کے رابطہ سے سنسکرت ادب سے لاعلم لوگ بھی ہندو اور ہندوستان کا تلفظ کرنے لگے اور انگریزوں نے ہند لفظ میں اپنی زبان کی خصوصیت کے پیش نظر (Hind) ہند کا (ہَ) لوپ کرکے انڈ (Ind) اور انڈو (Indo) اور ملک کی ترجمانی و نسبت والے (سُوچَک) IA جوڑ کر انڈیا (India) بنا دیا۔ اور انڈیا میں رہنے والے انڈین (Indian) کہے جانے لگے۔ خلاصہ یہ کہ بھارتیے، ہندو اور انڈین کا ایک ہی مطلب ہوا''۔(۱۲)

اسی طرح دائرہ معارف اسلامیہ میں مذکور ہے کہ:

''اہل فارس نے جب اس ملک کے ایک صوبے پر قبضہ کرلیا تو اس دریا کے نام پر جسے اب سندھ کہتے ہیں ہندو رکھا کیونکہ ایران قدیم کی زبان پہلوی میں اور سنسکرت میں س کو اور ہ کو آپس میں بدل لیا کرتے تھے۔ چنانچہ فارس والوں نے ''ہندہو'' کہہ کر پکارا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو ہند کہا اور آخر میں یہی نام تمام دنیا میں پھیل گیا۔ پھر (ہ) کا حرف (الف) میں بدل کر یہ نام فرینچ میں انڈ (Ind) اور انگریزی میں انڈیا (India) کی صورت میں مشہور ہوگیا۔ خیبر سے داخل ہونے والی دیگر قوموں نے اس کا نام ''ہندواستھان'' رکھا جس کو فارسی تلفظ میں ''ہندوستان'' بولا جاتا ہے''۔(۱۳)

جملہ حوالہ جات و دلائل سے صاف ظاہر ہے کہ ہندو کسی دھرم یا مذہب کا نام نہیں بلکہ ایک

خاص ملک یا ایک مخصوص علاقے میں رہنے والی قوم کا نام ہے جو غیر ملکیوں کا دیا ہوا ہے۔

اس تعلق سے آر ایس ایس کے دوسرے سر سنگھ چالک اور مفکر و رہنما گرو گولوالکر سے جب دریافت کیا گیا کہ سوامی دیانند سرسوتی یہ کہتے تھے کہ ہندو نام غیر ملکیوں کا دیا ہوا نام ہے جس کے معنی ڈاکو کے ہوتے ہیں۔ (چنانچہ لغات کشوری میں ہے، ہندو مشہور ملک کا نام ہے اس لفظ میں نسبت کا واؤ جوڑ دیا گیا ہے جس کا معنی ہندوستان کا رہنے والا یعنی واؤ کی نسبت خاص انسانوں کے ساتھ ہے اور فارسی محاورہ میں لفظ ہندو بمعنی چور، ڈاکو، رہزن اور غلام کے لیے آتا ہے) (۱۴)۔ تب گرو گولوالکر نے جواب دیا میں مورخ (اِتیہاس کار) ہونے کا تو دعویٰ نہیں کرتا البتہ لفظ ہندو کو صرف اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ عام ہو چکا ہے اور لوگوں نے اس کو قبول بھی کر لیا ہے۔ (۱۵)

اس کے علاوہ گرو گولوالکر نے اس لفظ کو ہندی الاصل ثابت کرنے کی بھی ناکام کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''دراصل لفظ ''ہندو'' دو اجزاء کا مرکب ہے ہِ (HI) اور اندو (INDU) ہِ (HI) ہمالیہ سے لیا گیا ہے اور اندو (INDU) اندو، اندوسروور سے۔ اس لیے ہندو سے مراد وہ سرزمین ہے جو ہمالیہ اور ہندساگر کے درمیان واقع ہے''۔ (۱۶)

گولوالکر صاحب کی اس دلیل اور وضاحت سے بھی واضح طور پر یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ لفظ ''ہندو'' ہندوستان کی جغرافیائی حالت کا ترجمان ہے نہ کہ ہندو دھرم کا۔ اور اس کی رو سے ہر ہندوستانی ہندو ہے چاہے وہ کسی مذہب یا دھرم کا پیرو کار ہو۔

لفظ ''ہندو'' کا اصطلاحی معنی و مفہوم: اہل علم کی تحقیق و فکر کے مطابق ہندو دھرم غالباً دنیا کا پہلا دھرم ہے کہ بڑا سے بڑا ہندو دھرم گرو یا مفکر و محقق اس کی جامع و مانع تعریف یا اصطلاحی معنی بیان نہیں کر سکتا، جبکہ ہر مذہب کی ایک تعریف (Definition) ہوتی ہے۔ باوجود اس کے بعض ہندو محققین و علماء نے اپنی علمی و فکری لیاقت و صلاحیت کی بنا پر تعریف کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جب آپ تحقیقی نظر سے غور کریں گے تو ہر ایک تعریف ناقص و نامکمل نظر آئے گی۔ اس لیے کہ ہر مذہب کا ایک مرکزی و بنیادی عقیدہ ہوتا ہے، ایک مخصوص مذہبی کتاب ہوتی ہے اور اس کا ایک خاص رسول یا رہنما ہوتا ہے لیکن ہندو مذہب میں ہم ایسا کچھ نہیں پاتے۔ کیونکہ ہندو دھرم میں کوئی ایک مذہبی کتاب، کوئی ایک

مذہبی رہنما یا کوئی ایک بنیادی عقیدہ نہیں۔اس کے اصل الاصول احکام وقوانین اور معاشرتی و مذہبی طور طریقوں میں بھی بےحد اختلاف ہے۔مثلاً:

ایک ایشور کی پوجا کرنے والے بھی ہندو اور ۳۳/کروڑ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے والے بھی ہندو۔

مورتی پوجنے والے بھی ہندو اور مخالفت کرنے والے بھی ہندو جیسے سناتن اور آریا سماج۔

وشنو دھرم کے مطابق گوشت نہ کھانے والے شیو بھی ہندو اور شاکت مت کے مطابق گوشت کھانے والے شاکت بھی ہندو۔

ایک ایشور کو ماننے والے بھی ہندو اور ۲۴/اوتاروں کو خدائی میں شریک سمجھ کر ماننے والے بھی ہندو۔

پرانوں،مہابھارت، گیتا اور رامائن کو ماننے والے بھی ہندو اور ان میں عقیدہ ویقین نہ رکھنے والے بھی ہندو۔

''آستِک'' یعنی ایشور میں یقین رکھنے والے بھی ہندو اور''ناستِک'' یعنی خدا میں یقین نہ رکھنے والے بھی ہندو۔اسی طرح''آستک گرنتھ'' وید،اُپنشد وغیرہ کو ماننے والے بھی ہندو اور''ناستک گرنتھ''،''میمانسا'' کے پیروکار بھی ہندو۔

مندروں میں بے روک ٹوک جانے والے بھی ہندو اور وہاں سے مار کر بھگائے جانے والے شودر (اچھوت) بھی ہندو۔

رام اور سیتا کی پوجا کرنے والے بھی ہندو اور تمل ناڈو وغیرہ میں راون کی پوجا کرنے والے بھی ہندو۔

(اہنسا پرمو دھرم) رحم وکرم سب سے بڑا دھرم ہے کا نعرہ دے کر جانوروں کے قتل سے نفرت کرنے والے بھی ہندو اور کالی ماتا کے مندر، یگوں،دُرگا پوجا اور نودُرگوں میں بکرا،بھینس اور بیل کی بلی دینے والے بھی ہندو۔

پیتامبر یعنی پیلے کپڑے پہننے والے سادھو بھی ہندو اور مادرزاد ننگے رہنے والے جینی دھرم گرو اور ناگے سادھو بھی ہندو۔

اوتارواد پر یقین رکھنے والے بھی ہندو اور اوتارواد کی تردید کرنے والے بھی ہندو۔

گائے، پیپل کے درخت اور سانپ وغیرہ کے پجاری اور دودھ پلانے والے بھی ہندو اور ان کو ختم کرنے والے بھی ہندو۔

پیاز، لہسن نہ کھانے والے بھی ہندو اور انتہائی ناپسندیدہ اشیاء سانپ، کتّا، سُوَر اور بندر وغیرہ کھانے والے بھی ہندو۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ:

''ہندو دھرم جہاں تک کہ وہ ایک مذہب (مت) ہے، غیر واضح ہے۔ اس کی کوئی متعین شکل وصورت نہیں، اس کے کئی پہلو ہیں اور ایسا ہے کہ جو چاہے اس کو جس طرح کا چاہے مان لے۔ اس کی تعریف (Definiation) دے سکنا یا متعین صورت میں کہہ سکنا کہ عام فہم معنی میں یہ ایک مذہب (مت) ہے۔ اپنی موجودہ شکل میں، بلکہ گزشتہ زمانے میں بھی اس کے اندر بہت سے اعتقادات اور رسوم واعمال (کرم کانڈ) آملے ہیں۔ اونچے سے اونچے اور گرے سے گرے اور اکثر ان میں آپس کا تضاد واختلاف بھی ملتا ہے۔ اس کی خاص خواہش اور فکر یہ معلوم ہوتی ہے کہ خود کو زندہ رکھو اور دوسروں کو بھی جینے دو''۔(۱۷)

اسی طرح ڈاکٹر رادھا کرشنن نے تحریر کیا ہے کہ ہندو کوئی مذہب نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ چنانچہ وہ ہندو دھرم سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس کو زندگی گزارنے کا طریقہ (جیون پراڑلی) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بہ مقابل اس کے کہ آپ اس کو کسی مخصوص اعتقاد ونظریے کا حامل تصور کریں۔ اگر ایک طرف یہ لوگوں کو خیالات وتصورات کی دنیا میں مکمل آزادی فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف لوگوں کو ملک کے باضابطہ رسم ورواج کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ خدا کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں سب خود کو ہندو کہہ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ ہندوؤں کی تہذیب (سبھیتا) اور طرز حیات پر گامزن ہوں''۔(۱۸)

ہندو دھرم کے محققین اور آر ایس ایس کے فکری و مذہبی رہنما بھی اس کی تصدیق کرتے

ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کا قول ہے کہ:

''حقیقت میں ہندو کوئی مذہب نہیں بلکہ ایک کلچر (تہذیب) ہے''۔(۱۹)

"World Civilization" کے دونوں مصنّفین کی فکر و تحقیق بھی اسی بات کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں:

''اہل مغرب کی اصطلاح کے مطابق ہندو ازم کو مذہب نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ ہر طرح کے عقائد کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔تمام رسم ورواج کو اپنا لیتا ہے چاہے وہ قدیم زمانے کے گھناؤنے رسم ورواج ہوں یا دور جدید کے ارفع واعلیٰ رسم ورواج۔ہندومت کے کوئی متعین اصول وعقائد نہیں۔لیکن برہمنوں کی پیروی سب کے لیے ضروری ہے نہ کہ کسی اور دیوتا کی''۔(۲۰)

سوامی اننیانند لکھتے ہیں کہ:

''ہندو دھرم کے مطابق دھرم ایک دائمی زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔مذہبی عقائد واحکام کو عملی زندگی میں اتارنا بھی اس کا مقصود ہے۔ہندو دھرم سب دھرموں کی ایکتا کو مانتا ہے۔دھرم کے نام پر اس کا کسی سے کوئی اختلاف نہیں۔ہندو دھرم عملی (ویوھارک) دھرم ہے۔یہ ایک مکمل اور بہتر طرزِ حیات کا آئینہ دار ہے''۔(۲۱)

اسی طرح ویوگ ہری کہتے ہیں:

''یہ ہمیشہ رہنے والا دھرم ہے،اس میں سبھی کچھ شامل ہے۔اصل میں یہ ایک فلسفۂ زندگی (جیون درشن) ہے''۔(۲۲)

مذکورہ بالا حوالہ جات سے صاف ظاہر ہے کہ ہندو دھرم کوئی دھرم مت یا مذہب نہیں بلکہ ایک طریقۂ زندگی اور تہذیب ہے اور اس کے کوئی خاص عقائد واصول واحکام وقوانین نہیں۔ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کی تعریف بیان کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔تاہم بعض ہندو محققین و مفکرین نے مختلف زاویوں سے اس کی تعریف پیش کرنے کی ہمت کی ہے،مثلاً:

سوامی وویکانند کہتے ہیں کہ ''جو اپنے آپ کو ہندو سمجھے وہ ہندو ہے''۔ کسی نے کہا کہ جو گائے نہ کھاتا ہو وہ ہندو ہے۔ گائے ہی دھرم ہے گائے ہی وید ہے۔ کسی نے بیان کیا کہ جو گائے کی پوجا کرے وہ ہندو ہے۔

بعض ہندو علماء و دانشوران نے ہندو کی تعریف کے تعلق سے یہ تاثر پیش کیا ہے کہ ہندو وہ ہے جو برہمن اور گائے کی عزت کرتا ہے، ذات پات کے نظام کا قائل ہے اور عقیدۂ تناسخ پر ایمان رکھتا ہے۔ (۲۳)

کسی نے کہا: ''ہنسا دائنت ہندو'' یعنی جو ہنسا، ظلم و ستم کو دور کرے وہ ہندو ہے۔ اور کسی نے کہا کہ جو ذات پات کے مذہبی نظام سے عاری لوگوں کو قصوروار بتائیں وہ ہندو ہیں۔ (ہندو جاتی کا اُتّھان اور پتن، ص ۷)

مہاتما گاندھی نے بھی ہندو دھرم کی تعریف (پریبھاشا) پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر مجھ سے ہندومت کی تعریف (Definition) کرنے کو کہا جائے تو میں صرف یہ کہوں گا کہ یہ غیر متشددانہ و غیر ظالمانہ ذرائع سے سچ (ستیہ) کی کھوج ہے۔ آدمی چاہے خدا (ایشور) میں یقین نہ رکھے پھر بھی وہ خود کو ہندو کہہ سکتا ہے۔ ہندو دھرم سچ (ستیہ) کی مسلسل کھوج ہے۔ ہندو دھرم سچ (ستیہ) کو ماننے والا دھرم ہے۔ سچ ہی ایشور (ایشور) ہے۔ ہم اس بات سے متعارف ہیں کہ ایشور سے انکار کیا گیا ہے۔ ہم نے سچ سے کبھی انکار نہیں کیا ہے''۔

اس تعریف پر پنڈت جواہر لال نہرو تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گاندھی جی اس (ہندو دھرم) کو سچ اور عدم تشدد (اہنسا) بتاتے ہیں۔ لیکن بہت سے خاص لوگ جن کے ہندو ہونے میں کوئی شک نہیں یہ کہتے ہیں کہ عدم تشدد (اہنسا) جیسا اس کو گاندھی سمجھتے ہیں، ہندومت کا ضروری حصہ نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں ہندومت کا واحد ترجمان سچ (ستیہ) رہ جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی تعریف (پریبھاشا) نہ ہوئی۔

شاید اسی صورت حال کو دیکھ کر ہی لوکمانے تِلک نے دھرم کی یہ نئی تعریف (Definition)

بنائی تھی جو مضحکہ خیز وطنز آمیز ہونے پر بھی مذاق وطنز نہیں سچ ہے۔

प्रमाण्यबुद्धिर्वेदेषु साधनानाम नेकता!

उपास्यानामनियमं एतद्धर्मस्थ लक्षणम।।

''ویدوں کو ثبوت ماننا، ذرائع و وسائل کے اختلاف میں یقین رکھنا اور عبادت و بندگی میں کسی ایک دیوتا کا اصول وضابطہ نہیں رکھنا یہ دھرم کی علامت ہے''۔(۲۵)

حوالہ جات

(۱) ہندو دھرم کا سوار بھوم تتو (لے) سوامی اننیا نند،ص ا، ناشر ادھیت آشرم،کلکتہ،۱۹۹۷ء۔(۲) ہندو جاتی کا اُتھان اور پتن (لے) رجنی کانت شاستری، ناشر کتاب محل، نئی دلی، ۲۰۰۸ء۔(۳) تاریخ طبری، ج ۳،ص ۱۶۵،طبقات ابن سعد، ج ا،ص ۳۳۹،سیرت ابن ہشام، ج ۲،ص ۵۹۳۔(۴) سنسکرتی کے چار ادھیائے،ص ۳۵۔(۵) ہندو جاتی کا اُتھان اور پتن،ص ۳و۴۔(۶) سنسکرتی کے چار ادھیائے،ص ۳۵و۳۶۔(۷) ہندو دھرم کا سوار بھوم تتو،ص ۳۔(۸) ہندو دھرم (لے)، ویوگ ہری،ص ۷و۸، سستا ساہتیہ منڈل، دلی، ۲۰۰۱ء۔(۹) ہندو دھرم،ص ۸۔

(۱۰) ہندوستانی کا اُتھان اور پتن،ص ا۔(۱۱) ایضاً،ص ۲۔(۱۲) کالیکا اوتار اور محمد،ص ۲۳۔(۱۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۳،ص ۱۷۳،عرب و ہند کے تعلقات،ص ۱۲۔۱۳۔(۱۴) لغات کشوری،ص ۸۲۱، سید تصدق حسین رضوی، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۹۹۴ء۔(۱۵) شری گرو جی سمرگ درشن کھنڈ،ص ۱۰۰۔

(۱۶) Bunch of thought, 130۔ (۱۷) ہندوستان کی کہانی (لے)، پنڈت جواہر لال نہرو،ص ۷۹،۸۰۔

(۱۸) The Hindu View of Lifr, p.70۔ (۱۹) Hindu Phenomenon, pp.14۔

(۲۰) ضیاء النبی، ج ا،ص ۱۸۰، Worl Civilization, p.88۔

(۲۱) ہندو دھرم کا سوار بھوم تتو،ص ۱۱ تا ۱۳۔(۲۲) ہندو دھرم،ص ۱۰،۱۱۔(۲۳) ضیاء النبی، ج ا،ص ۱۸۱۔(۲۴) ہندوستان کی کہانی،ص ۸۰۔(۲۵) سنسکرتی کے چار ادھیائے،ص ۷۵۔

روداد سیمینار 'سرسید کی عصری معنویت'

۳۱/اکتوبر۔ یکم نومبر ۲۰۱۷ء

کلیم صفات اصلاحی

سرسید کی عظمت واہمیت ان کے ناقابل فراموش کارناموں کے سبب سے ہے۔انہوں نے ملک وملت کو پس ماندگی و جہالت کے دلدل سے نکالنے کے لیے جو عظیم الشان علمی و تعلیمی منصوبہ بنایا اوراس کی تیکمیل کے لیے اپنے دور کے مخلص ترین اہل علم وفضل کی جو جماعت تیار کی وہ ان کی روشن خیالی، مستقبل شناسی اور حسن تدبیر کا نتیجہ تھی۔حقیقت یہ ہے کہ سرسید محض مسلمانوں کے رہنما اور راہبر ہی نہیں تھے بلکہ ان کی خدمات اور فکر وعمل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔یہی وجہ ہے کہ سرسید کی فکر اور ان کی علی گڑھ تحریک کے اثرات برصغیر سے باہر بھی محسوس کیے جاتے ہیں۔

سرسید کی پیدائش پر ۱۷/اکتوبر ۲۰۱۷ء کو دوسو سال پورے ہو گئے۔ملک و بیرون ملک ان کی ولادت کا جشن اس سال کے آغاز سے اب تک جاری ہے۔اہل اعظم گڑھ بالخصوص علامہ شبلی سے سرسید کے خصوصی تعلق اور دونوں کی مشترکہ خدمات ہندوستان کی علمی، تعلیمی اور ادبی تاریخ کا روشن ترین باب ہیں۔اسی دیرینہ تعلق کے پیش نظر دارالمصنّفین نے سرسید کے مشن اور ان کے افکار و نظریات اور عہد حاضر میں ان کی معنویت پر ایک دوروزہ سیمینار کے انعقاد کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے منتخب شذرات سرسید کے ایک مجموعہ کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا۔یہ سیمینار بحمداللہ ۳۱/اکتوبر۔۱/نومبر ۲۰۱۷ء کو دارالمصنّفین میں منعقد ہوا۔

افتتاحی اجلاس ۳۱/اکتوبر صبح ساڑھے نو بجے ہوا۔اس کی صدارت جناب نسیم احمد آئی،اے، ایس (ریٹائرڈ) وسابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کی اور نظامت کے فرائض مولانا

رفیق دارالمصنّفین،شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ۔

حافظ عمیر الصدیق ندوی دریابادی نے انجام دیے۔ تلاوت حافظ عبدالرحمٰن قمر عباسی نے کی۔ کلیدی خطبہ پروفیسر اصغر عباس، سابق ڈائریکٹر سرسید اکیڈمی اور صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور خطبۂ استقبالیہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ڈائریکٹر دارالمصنّفین نے پیش کیا۔

ناظم اجلاس نے سرسید کی عصری معنویت پر منعقد اس سیمینار کی غرض و غایت اور سرسید کی مخلصانہ مساعی کا مختصراً تذکرہ کرتے ہوئے مولانا حالی کے حوالہ سے کہا کہ اسلام کی محبت اور قوم کی فکر سرسید کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اسی چیز نے ان کو اپنے وقت کا سب سے بڑا مصلح و مجدد بنادیا اور بلاشبہہ بعض حیثیتوں سے وہ نمونۂ اسلاف تھے۔ ان کی ولادت کے دوسو سال پورا ہونے پر آج ہم اسی لیے جمع ہوئے ہیں کہ ان کی معنویت کو پھر سے پانے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

ناظم دارالمصنّفین اور سیمینار کے کنویز پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے اپنے خطبہ میں مہمانوں اور مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ملک و ملت کے عظیم محسن سرسید کی یاد میں منعقد کیے جانے والے اس دوروزہ سیمینار میں آپ سب کا علم و دانش کے اس مرکز میں خیر مقدم ہے۔ احسان شناسی انسانی اقدار میں بہت بلند مقام رکھتی ہے۔ زندہ قومیں اپنے محسنین کو یاد رکھتی ہیں جبکہ روبہ زوال قومیں ان کے احسانات کو بھلا دیتی ہیں۔ سرسید کے احسانات ملت اور ملک پر اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنا بھی آسان نہیں۔ علامہ شبلی نے ایک جگہ لکھا تھا کہ کون ہے جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھاسکتا ہے۔ انہوں نے یہ بات ایک خاص سیاق و سباق میں لکھی تھی لیکن یہ عمومی طور پر بھی درست ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ عام طور پر سرسید کی جو یہ شبیہ پیش کی گئی کہ علم جدید کے بہت بڑے علم بردار ہونے کی حیثیت سے انہوں نے قدیم سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اس سے زیادہ غلط اور کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ سرسید نے جدید کو گلے اس لیے لگایا تھا کہ ان کا پختہ یقین تھا کہ جب تک مسلمان جدید علوم میں آگے نہیں آئیں گے، اس وقت تک ان کے سامنے ترقی کا دروازہ نہیں کھلے گا اور قوموں کے درمیان ان کو وہ عزت و وقار حاصل نہیں ہوگا جس کو وہ کھوچکے ہیں لیکن اس کے ساتھ ان کو اپنا ماضی بے حد عزیز تھا۔ تاریخ فیروز شاہی، آئین اکبری، تزک جہاں گیری اور آثار الصنادید جیسے اہم تاریخی مآخذ کی تحقیق و تدوین کا مشکل کام کوئی ایسا آدمی نہیں کرسکتا تھا جس کو اپنا ماضی عزیز نہ ہو۔ جو قوم ۱۸۵۷ء کے خونچکاں اور قیامت خیز واقعہ کے بعد اپنی ہمت، استقلال اور اعتماد سب کچھ کھوچکی

تھی سرسید نے ان کے اندر حوصلہ پیدا کیا اور ان کے اندر اپنے کھوئے ہوئے مقام کی بازیافت کی تڑپ اور ضرورت کا احساس بیدار کیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ نسل تیار ہوئی، جس نے آگے چل کر مسلمانوں کی رہنمائی کی اور بڑی حد تک اس ذمہ داری کو پورا کیا۔ آج کے حالات اس وقت کے حالات سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ سرسید کی کوششوں اور سو سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود تعلیم کے میدان میں ہم اہل وطن بھائیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ حالات وہی ہیں اس لیے بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ سرسید نے جو تحریک برپا کی تھی اس کی معنویت کو ہم پھر سے تلاش کریں اور ہم سب مل کر اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔

اس کے بعد دارالمصنّفین کی نئی پیش کش مطبوعات دارالمصنّفین کے ای بک پروگرام کا افتتاح تھا۔ اس موقع پر پروفیسر ظلی نے اکیڈمی کی سائٹ تیار کرنے والے جناب افضال عثمانی، ای بک پروگرام تیار کرنے اور اس سلسلہ کی دوسری اہم خدمات انجام دینے والوں جناب عاکف عبدالرحمٰن، مرزا احمدان بیگ اور حافظ عبدالرحمٰن قمر عباسی کو اسٹیج پر بلا کر ان کا مختصراً تعارف بھی کرایا۔ عاکف عبدالرحمٰن نے پروجیکٹر کی مدد سے ای بک کے طریقۂ استعمال کی تفصیلات سے بھی حاضرین کو روشناس کرایا۔ اس کے بعد ''شذرات سرسید، جلد اول'' تقدیم و ترتیب پروفیسر اصغر عباس اور ''علی گڑھ انسٹی گزٹ کا توضیحی اشاریہ'' مرتبہ ڈاکٹر محمد طاہر، شبلی کالج کا اجرا عمل میں آیا۔ خاص بات یہ ہے کہ مکمل پروگرام یوٹیوب اور فیس بک پر انٹرنیٹ صارفین کے مشاہدے کے لیے براہِ راست نشر کیا جا رہا تھا۔ یہ خدمت مرزا حمدان بیگ صاحب نے اپنی خصوصی مہارت سے انجام دی۔

پروفیسر اصغر عباس صاحب نے اپنے کلیدی خطبہ میں ''ہندوستان کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید تحریک کے مقام'' کے موضوع پر بڑی مدلل اور معرکہ آرا گفتگو کی اور اس سلسلہ کے بعض نئے گوشے سامنے آئے۔ خطبہ میں پہلے انہوں نے اس بات کا انکشاف کیا کہ مجلس کے صدر نشین جناب نسیم احمد صاحب کے دور وائس چانسلری میں سرسید کی سوانح اور ان کی تصنیفات کی جس قدر اشاعت ہوئی کسی دور میں نہیں ہوئی۔ انہوں نے کل ۲۸ کتابیں شائع کیں۔ سرسید تحریک کے متعلق ان کی یہ رائے قابل توجہ ہے کہ سرسید تحریک ان عام اصلاحی تحریکوں کا جز ہے جو انیسویں صدی کی ابتدا سے ہندوستان میں جاری تھیں البتہ یہ وسعت اور جامعیت کہیں اور موجود نہیں۔ دوسری تحریکیں سماج کے کسی مخصوص طبقہ

کے لیے تھیں جبکہ سرسید کی تحریک ملک کے تمام باشندوں کی بہبودی کی خواہاں بھی۔ سرسید کے کارناموں کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے زمانہ کے حالات اور ہندوستان کی دوسری اصلاحی تحریکات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کیونکہ اسی روشنی میں سرسید کی اصلاحی جدوجہد اپنی صحیح شکل میں واضح ہوسکتی ہے۔ انہوں نے سرسید تحریک کی معنویت اور ان کے عہد کے سیاسی وسماجی پس منظر پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ سرسید تحریک کا مقصد پورے ملک میں روشن ضمیری پھیلانا اور ہندوستانی اقوام کو ترقی کے برابر مواقع فراہم کرانا تھا۔ وہ انیسویں صدی کے واحد رہنما ہیں جنہوں نے غیر مسلم تعلیمی اداروں میں خود جاکر وہاں کے طلبہ واساتذہ کو خطاب کیا اور ان کے سامنے حب الوطنی اور قومیت کا حقیقی تصور پیش کیا۔ انہوں نے ہندوستان اور مسلمانوں کو درپیش تمام مسائل کو ہمدردانہ نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ ان کی تحریک کوئی مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی کی ایک تہذیب پر مرتکز تحریک تھی۔ انہوں نے زمانے کے جدید تقاضوں کو پورے طور پر محسوس کیا تھا۔ اسی لیے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر ان کی نگاہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جدید تعلیم کے بغیر حالات بدلنے والے نہیں ہیں۔ انہوں نے ملک کی فلاح وبہبود کی خاطر تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے تحریک چلائی تھی لیکن افسوس کہ ان کا خواب آج تک شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

نسیم احمد صاحب نے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ مختصر وقت میں سرسیدؒ کی خدمات کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ سرسید اور ان کی تحریک کی معنویت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی ان کے زمانہ میں تھی۔ ان کا شمار ہندوستان کی عظیم شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے انتہائی اہم موضوعات پر اعلیٰ پایہ کی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں جن کی اہمیت ومعنویت سے آج بھی انکار ممکن نہیں۔ انہوں نے سرسید کی مجموعی خدمات کا جذباتی انداز میں ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سرسید ہندوستان میں بسنے والی تمام اقوام کی یکساں طور پر ترقی کے خواہاں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی ہر کاوش کا محور ومرکز مسلمان ہوا کرتے تھے لیکن ان کے کاموں سے ہندو اور مسلمان دونوں مستفید ہوئے۔ ایسی صورت میں ان پر صرف مسلمانوں کی ترقی کے حامی ہونے کا الزام غلط اور بے بنیاد ہے۔ سرسید عملی آدمی تھے۔ انہوں نے جو سوچا کر کے دکھایا مگر آج صرف ہمارے دعوے اور وعدے ہیں۔ سرسید کے افکار کی وسعت اور جامعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم اس کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنے کاموں کا ان سے مقابلہ کریں تو ان کے سامنے ہم

کچھ بھی نہیں ہیں۔ وہ مرد مجاہد ہر چیز کا جواب تو دیتے تھے مگر نہایت سلجھے انداز میں دیتے تھے۔ آخر میں اکبرالہ آبادی کے اس مصرع پر اپنی بات ختم کی ع ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا

اس افتتاحی اجلاس کے اختتام کے ۱۵ر منٹ بعد سوا گیارہ بجے مقالات کی پہلی نشست شروع ہوئی۔ اس کی صدارت پروفیسر مظہر مہدی اور نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ اس میں ناظم اجلاس نے پہلے اپنا مقالہ ''مکاتیب سرسید کی عصری معنویت''، ڈاکٹر خان فاروق نے ''سرسید کی تعلیم اور مسلمان''، ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے ''افکار سرسید شذرات سرسید کی روشنی میں''، ڈاکٹر عطا خورشید نے ''کیا سیرت فریدیہ سرسید کی تصنیف ہے؟''، ڈاکٹر راہی فدائی نے ''سرسید کے افکار اور جنوبی ہند''، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے ''سرسید اور اعظم گڑھ''، ڈاکٹر محمد طاہر نے ''اسلوب سرسید۔ تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر محمد شارق نے ''سرسید اور اردو زبان و ادب'' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ صدارتی تقریر کے بعد مقالات کا پہلا شیشن ختم ہوا۔

مقالات کی دوسری نشست بعد نماز مغرب ۶ بجے شروع ہوئی۔ اس کی صدارت پروفیسر صغیر افراہیم اور نظامت مولانا اشہد جمال ندوی نے کی۔ اس میں ڈاکٹر ثاقب ندوی نے ''سرسید اور مستشرقین۔ خطبات احمدیہ کے حوالہ سے''، جناب افضال عثمانی نے ''علی گڑھ تحریک عہد حاضر کے تناظر میں''، راقم نے ''شبلی کی سرسید شناسی''، ڈاکٹر شباب الدین نے ''سرسید کا سفرنامہ ''مسافران لندن۔ قومی سورت گری کا جذبۂ فراواں''، ڈاکٹر صفدر امام قادری نے ''سرسید کے تعلیمی نظریات (خواتین کی تعلیم کے حوالے سے)''، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے ''تبیین الکلام۔ ایک تحلیلی جائزہ''، ڈاکٹر شمس بدایونی نے ''سرسید کے کمیاب مجموعہ ہائے خطوط''، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے ''سرسید اور ۱۸۵۷ء کے بعد کا ادبی منظرنامہ''، ڈاکٹر راحت ابرار نے ''ہندوستان کی تحریکوں میں علی گڑھ کا مقام''، پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ''سرسید احمد خاں اور اردو لغت کے مسائل''، ناظم اجلاس نے ''سرسید کیا چاہتے تھے اور ہم کیا ہیں'' کے موضوع پر اپنے مقالات پڑھے۔ صدر اجلاس کے تاثراتی خطاب کے بعد یہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

مقالات کا تیسرا اجلاس یکم نومبر ۹ بجے صبح شروع ہوا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر شمس بدایونی اور نظامت ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے کی۔ اس میں ڈاکٹر احسان اللہ فہد فلاحی، پروفیسر صغیر افراہیم،

پروفیسر سعود عالم قاسمی، ڈاکٹر مظفر حسین سید، ڈاکٹر علاء الدین خاں، مولانا عمیر الصدیق ندوی، مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی قاسمی نے بالترتیب سرسید اور تعلیم نسواں، جنگ آزادی۔ علمائے کرام اور سرسید کا نظریۂ مفاہمت، سرسید اور علامہ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کی نظر میں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جائزہ، اسباب بغاوت ہند کا تجزیاتی مطالعہ، سرسید، دارالمصنّفین اور معارف، تحریر فی اصول التفسیر ایک مطالعہ کے موضوعات پر مقالات پیش کیے۔ صدر اجلاس کی تقریر کے بعد اس اجلاس کا اختتام ہوا۔

مقالات کی آخری نشست کی صدارت پروفیسر سعود عالم قاسمی اور نظامت ڈاکٹر خان فاروق نے کی۔ اس میں تین مقالے سرسید کا نظریہ قوم اور ان کے سیکولر نظریات، سرسید کی تعلیمی کاوشیں اور لائحہ عمل اور طلبہ کی ذہن سازی، برطانوی علی گڑھ میں، کے عنوان سے بالترتیب درج ذیل اہل قلم ڈاکٹر عبداللہ امتیاز، پروفیسر محمد سجاد اور پروفیسر مظہر مہدی نے پیش کیے۔ آخر میں صدر اجلاس نے مقالات پر اپنی گراں قدر رائے ظاہر کی۔

سیمینار سے متعلق تاثرات کے لیے خاص کی گئی نشست کی صدارت ڈاکٹر راہی فدائی اور نظامت ڈاکٹر علاء الدین خاں نے کی۔ اس میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ سیمینار کے موضوع کا انتخاب بہت اہم ہے۔ مقالات بھی بہت اچھے پیش کیے گئے۔ خاص بات یہ تھی کہ اردو، عربی اور فارسی مقالہ نگاروں کے ساتھ پروفیسر ظلی صاحب نے اس بار سیمینار میں اہل تاریخ و صحافت کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی۔ ہر زاویہ سے یہ سیمینار بہت کامیاب رہا، تقریباً ہر مقالہ میں سرسید کی عصری معنویت کی بازیافت کی کامیاب کوشش کی گئی، انہوں نے تہذیب الاخلاق کا ایک خاص نمبر علامہ شبلی کے شایان شان نکالنے کا اعلان کیا، ان کے بقول تہذیب الاخلاق نے ابھی تک یہ قرض ادا نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کہا کہ دارالمصنّفین میں اہل علم و تحقیق کا آنا ان کے لیے بڑا اشرف ہے۔ کسی بھی سیمینار میں پچاس فیصد قابل اشاعت مقالات کا آنا اس کے کامیاب ہونے کی دلیل ہے۔ اس سیمینار میں تو یہ تناسب پچاس فیصد سے کہیں زیادہ ہے۔ بعض تقریریں اور مقالے ایسے سامنے آئے کہ جس سے سمجھ میں آیا کہ گرچہ سرسید پر ہزاروں مقالے اور کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں تاہم ان پر کام کرنے کے لیے اب بھی بہت گنجائش ہے۔ انہوں نے کہا کہ سیمینار میں لوگ کم آتے

ہیں تاہم باشندگان اعظم گڑھ کی تعداد کو جب ہم معیار کے میزان پر تولتے ہیں تو وہ سینکڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔انہوں نے ہال کے اندر مائیک کے نظام کو بہتر بنانے کی تجویز پیش کی۔

پروفیسر سعود عالم قاسمی نے اپنے تاثراتی خطاب میں کہا کہ جن بزرگوں کی کتابوں کو پڑھ کر ہم لوگوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا ان پر منعقد کیے جانے والے سیمیناروں میں حاضری ہمارے لیے بہت بڑی سعادت ہے۔سیمینار کا عنوان بہت اچھا رکھا گیا۔اس لیے کہ سرسید محض ماضی کا حوالہ نہیں ہیں، مستقبل کی امید بھی ہیں۔اسی لیے علامہ شبلی نے ان پر جو نظم لکھی اس کا نام صبح امید رکھا۔سرسید کی معنویت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے چیلنجوں کا مقابلہ جس پامردی اور استقلال سے کیا اور اس کے سامنے جس طرح سدآہنی بن گئے اس کا فیض ہم آج اٹھا رہے ہیں۔عہد حاضر کے علما سرسید کی ان خدمات کی روشنی میں جدید چیلنجوں کو قبول کرکے آگے بڑھیں۔اگر اس قسم کا کوئی پیغام اس جگہ سے جاتا ہے تو یہ سرسید کو سب سے بڑا اخراج عقیدت ہے۔صدر اجلاس کے مفید خطاب کے بعد کلمات تشکر کے لیے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی تشریف لائے۔انہوں نے حسب معمول سب سے پہلے اس سیمینار کے انعقاد پر رب کائنات کی بارگاہ میں نذرانۂ سپاس پیش کیا۔حوصلہ شکن اور نامساعد حالات کے باوجود اس پُروقار سیمینار کے انعقاد کی تفصیل اس احساس کے ساتھ پیش کی کہ ہماری یہ بڑی محرومی ہے کہ جس بطل جلیل نے ہمارے اندر حوصلہ پیدا کیا، اس کی پیدائش کو دوسو سال مکمل ہونے پر بھی ہم نے اس کے شایان شان کوئی بڑا کام نہیں کیا۔دو دن کے اندر اس سیمینار میں جو مقالات پیش کیے گئے ان میں توازن، اعتدال اور معروضی نقطۂ نظر حاوی تھا۔بعض موضوعات بڑے حساس تھے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ تمام مقالہ نگاروں نے اس علمی و تحقیقی معیار کو باقی رکھا جو دارالمصنّفین کی شناخت ہے، جہاں اپنی بات سلیقہ سے کہہ دی جاتی ہے، جہاں اختلاف کا اظہار بھی اس طرح کیا جاتا ہے جو گراں نہ گذرے۔ سیمینار کے اس مثبت پہلو میں کارفرما سرسید اور علامہ شبلی نعمانی کا خلوص تھا۔تہذیب الاخلاق کے شبلی نمبر کے لیے انہوں نے ہر ممکن تعاون کا اظہار کیا اور مندوبین و شرکائے سیمینار سے کہا کہ ہم انتہائی شکرگذار ہیں کہ آپ نے ہماری دعوت قبول کرکے ہماری عزت افزائی فرمائی اور امید کرتے ہیں کہ اس ادارے کو اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔شکریہ

اخبار علمیہ

''طوطے کی حیرت انگیز تلاوت''

ایک خبر کے مطابق کاسکو (Casco) نسل کے طوطے بڑے ذہین اور ۳۰۰/الفاظ تک رٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ان کی اسی صلاحیت ولیاقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اردن میں ایک چھوٹی سی ڈینٹل لیباریٹری کے مالک حسین السوالمہ نے''مدلل'' نامی طوطے کی ایسی تربیت کی ہے کہ وہ قرآن مجید کی بعض مختصر سورتوں کے ساتھ ساتھ درود شریف، کلمۂ شہادت اور بعض اذکار سناتا ہے۔رپورٹ کے مطابق حسین نے اس کو اس وقت خریدا تھا، جب وہ چھ مہینے کا تھا۔گزشتہ پانچ برس سے وہ اس کی تربیت پر اپنی توجہ منعطف کیے ہوئے ہیں۔سورۂ لہب، سورۂ اخلاص، کلمۂ شہادت، درود شریف، بعض اذکار، سلام اور وداعی کلمات وہ اس کو ازبر کرا چکے ہیں۔مدلل خود تو ہر وقت تلاوت آیات اور ذکر خدا میں مصروف رہتا ہی ہے ساتھ ہی لیباریٹری میں آنے والوں کو''صل علی النبی ، صل علی النبی'' کہہ کر درود شریف پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔مدلل اب تک ۳۵۰/الفاظ یاد کر چکا ہے۔حسین نے اس کو ایک ہزار الفاظ تک یاد کرانے کا عزم ظاہر کیا ہے۔حسین کے بقول مدلل کی اس خصوصیت کے سبب وہ انہیں بہت عزیز و محبوب ہے اور وہ ان کے گھر کا ایک فرد بن چکا ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ اگر کوئی چھوٹا بچہ تلاوت کرے تو عجیب محسوس ہوتا ہے لیکن جب پرندہ کلام الٰہی روانی سے پڑھے تو یہ یقیناً معجزہ ہے۔ان کے مطابق مختلف پرندے انسانی بولے کے کچھ الفاظ سیکھ کر بول لیتے ہیں لیکن''مدلل'' جس عمدہ انداز اور تجوید کے ساتھ سورتوں کی تلاوت اور اسلامی کلمات ادا کرتا ہے اس کی مثال اب تک مفقود ہے۔حسین نے پہلے اس کو آیت کے مفردات، پھر پوری سورہ یاد کرائی۔سماجی روابط کی ویب سائٹ پر مدلل کی ویڈیو وائرل ہونے کے بعد متعدد عالمی ذرائع ابلاغ امریکی چینل اسکائی نیوز اور الجزیرہ وغیرہ اس لیباریٹری کا دورہ کر کے اس پر رپورٹ تیار کر چکے ہیں۔(تفصیلی رپورٹ منصف، حیدرآباد، ۴/ نومبر ۲۰۱۷ء میں ملاحظہ فرمائیں)

''امریکا کے دو عجیب وغریب اسکول''

امریکی شہر سلیم میں واقع ڈائن اسکول غیر معمولی واقعات اور آسیب کے سبب مشہور ہے۔اس

چھوٹے اسکول کا آغاز یکم اپریل ۲۰۰۹ء میں کیا گیا تھا۔اس کے بعد اسے شکاگو سے میساچیوسیٹس کے علاقے سلیم میں منتقل کیا گیا۔ یہاں جادو، جادوئی تحریروں اور آسیب وغیرہ کے کورس کو نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔آن لائن تدریس کا بھی انتظام ہے۔رپورٹ کے مطابق اب تک یہاں سے ڈھائی لاکھ افراد گریجویشن کر چکے ہیں۔امریکا ہی میں ''بروکلن فری اسکول'' نامی اسکول میں بچوں کو محض دو درجوں اَپر اور لُور میں تقسیم کیا گیا ہے۔اَپر میں ۱۱ر سے ۱۸ر اور لُور میں ۴ر سے ۱۱ر برس کے بچے داخلہ پاتے ہیں، اس کی خاص بات یہ ہے کہ تمام بچوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہیں تعلیم حاصل کریں۔اپنے درجہ کے علاوہ دوسرے درجوں میں جاکر جتنا وقت چاہیں گزار سکتے ہیں۔ یہاں نہ تو گریڈ دیا جاتا ہے نہ ہی امتحانات ہوتے ہیں اور نہ ہی درجہ میں حاضر ہونا ضروری ہے۔عام روش کے برخلاف اس غیر منضبط وغیر منظم اسکول کے سلسلہ میں ناقدین کی رائے یہ ہے کہ یہ اسکول حقیقت سے پرے اور طلبہ وطالبات کو حقیقی زندگی سے آگاہ نہیں کرتا۔ (منصف، حیدرآباد، ۱۵ر نومبر ۲۰۱۷ء)

''گوگل پکسل بڈز''

امریکی شہر سان فرانسسکو میں ٹیکنالوجی کمپنی گوگل نے اس نام سے ایک ایسا ہیڈ فون لانچ کرنے کا اعلان کیا ہے جو ۴۰ زبانوں میں فوری ترجمے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس کو متعارف کراتے ہوئے ایک خاتون اور مرد کے درمیان مکالمہ دکھایا گیا، جس میں مرد انگریزی اور خاتون سویڈش زبان بول رہی تھی، وائرلس گوگل پکسل بڈز، مرد کی انگریزی، فوری طور پر سویڈش زبان میں ترجمہ کر کے سنا رہے تھے، جبکہ خواتین کا سویڈش جواب ترجمہ ہو کر انگریزی میں سنائی دے رہا تھا۔(تعمیر فکر، بنگلور، جولائی تا اکتوبر ۲۰۱۷ء)

''جرمنی پسندیدہ ترین ممالک میں سرفہرست''

''نیشنز برانڈز انڈکس'' میں ملکوں کی مقبولیت کا سائنسی بنیادوں پر جائزہ وہاں کے افراد، حکومت، برآمدات، سیاحت اور مہاجرت سے متعلق پالیسیوں اور سرمایہ کاری جیسے چھ اہم نکات کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ ۲۰۱۷ء کے انڈکس میں دنیا کے ۵۰ر ممالک کی مقبولیت کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا جرمنی پسندیدہ ترین ممالک کی فہرست میں پہلے نمبر پر ہے۔گزشتہ برس یہ

اعزاز امریکہ کو حاصل تھا اور جرمنی دوسرے نمبر پر تھا۔سیاحت کے معاملہ میں جرمنی دسویں نمبر پر ہے۔ جرمن وزیر خارجہ نے اس خبر پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''جرمنی کا تاثر اب محض ہماری مضبوط معیشت کی بنیاد پر نہیں رہا۔دنیا جانتی ہے کہ ہم اس سے کہیں زیادہ قابل ہیں''۔امریکہ اس فہرست میں فرانس، برطانیہ، کناڈا، جاپان کے بعد چھٹے نمبر پر ہے۔حکومت کے زمرے میں اس سال اس کا ۲۳واں نمبر ہے۔غیر ملکیوں کی نظر میں اس کی بظاہر وجہ امریکہ کی موجودہ صدارت ہے۔(بحوالہ انقلاب، ۲۰/نومبر ۲۰۱۷ء)

''سعودیہ میں صوفیہ کی شہریت''

سائنسی ایجادات اور ٹیکنیکل علوم میں سعودی عرب گوکہ ترقی یافتہ ممالک سے کوسوں دور ہے تاہم قدرتی ذخائر اور مال و دولت کے سبب اس نے متعدد اولیات اپنے نام کی ہیں۔خبر ہے کہ اس نے پہلے انسان نما ذہین صوفیہ نامی روبوٹ کو شہریت دے دی ہے۔رپورٹ کے مطابق تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی روبوٹ کو کسی ملک کی شہریت سے نوازا گیا ہے۔شہریت پانے کے بعد صوفیہ کا ریاض میں انٹرویو کیا گیا، جس میں میزبان اینڈر ریوروز نے متعدد سوالات کیے اور اس نے اپنی ذہانت کے مطابق جواب دیے۔صوفیہ نے سعودی شہریت پانے پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے لیے قابل فخر لمحہ قرار دیا ہے۔(بحوالہ منصف، حیدرآباد، ۱۵/نومبر ۲۰۱۷ء)

ک،ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

پاکستان سے
چند جدید علمی تالیفات ومطبوعات-۲

ڈاکٹر عارف نوشاہی

پاکستان میں فارسی مخطوطات کی جامع فہرست: برصغیر پاک وہند مخطوطات کے ذخائر کے اعتبار سے دنیا کا مال دارترین خطہ ہے۔ ہندوئی اور اسلامی تہذیب کے حوالے سے یہاں عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور دیگر مقامی زبانوں کے جتنے مخطوطات ہیں، کسی اور خطے میں کم ہی ہوں گے۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ)، رام پور رضا لائبریری (رام پور)، ایشیاٹک سوسائٹی (کول کتہ) اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) جنوبی ایشیا میں مخطوطات کے قدیم مراکز ہیں۔ آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد برصغیر کے ممالک میں مزید ایسے کئی مراکز قائم ہوچکے ہیں اور یہ خطہ مخطوطات کے حوالے سے مستشرقین اور محققین کے لیے ہمیشہ توجہ کا مرکز رہا ہے۔ برصغیر میں مخطوطات کے مذکورہ بالا اہم مراکز کی مجمل اور مفصل فہارس مرتب ہوکر شایع ہوچکی ہیں۔ خطے میں مخطوطات کی ایک بڑی تعداد نجی اور ذاتی کتب خانوں میں پائی جاتی ہے، جن کی طرف کم ہی توجہ دی گئی ہے۔ پاکستان میں نجی کتب خانوں میں مخطوطات کی فہرست نویسی کا ایک تجربہ اس وقت ہوا جب ایرانی فہرست نویس احمد منزوی (۱۹۲۵-۲۰۱۵ء) نے تیرہ سال پاکستان میں مقیم رہ کر فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان تالیف کی اور اسے چودہ جلدوں میں مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان، اسلام آباد نے شایع کیا (عرصۂ اشاعت ۱۹۸۳-۱۹۹۷ء)۔ اس میں پاکستان کے سرکاری، غیرسرکاری، ذاتی، خانقاہی اور مدرسوں کے کتب خانوں میں موجود تقریباً ساٹھ ہزار فارسی مخطوطات کے کوائف جمع ہوئے ہیں۔ لیکن کام یہاں پر ختم نہیں ہوا تھا اور ابھی کئی ایسے ذخائر مخطوطات موجود تھے جو توجہ اور فہرست نگاری کے متقاضی تھے۔ چنانچہ ۲۰۱۰ء

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد۔

میں راقم السطور نے اسی منصوبے کو آگے بڑھانے پر کمر ہمت باندھی اور کام کا آغاز کیا اور توجہ پاکستان کے ذاتی کتب خانوں میں موجود فارسی مخطوطات کے کوائف جمع کرنے پر مرکوز رکھی۔اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کیمبرج (انگلستان) میں قائم ایک ادارے ''ہیئۃ المخطوطات الاسلامیۃ'' The Islamic Manuscript Association نے گرانٹ منظور کی اور سات سال یہ کام جاری رہا۔ کام کی تکمیل کے لیے نہ صرف میں نے خود کتب خانوں میں جاکر فہرست نویسی کی بلکہ کچھ اور دوستوں سے بھی مدد لی جو منزوی کی فہرست مشترک کے منصوبے کا حصّہ رہے تھے۔نیز شایع شدہ جدید فہارس مخطوطات کو بھی ماٰخذ بنایا۔اگرچہ پاکستان میں ذاتی کتب خانوں میں پڑے سینکڑوں مخطوطات کی فہرست نگاری کا کام اب بھی باقی تھا لیکن میں نے ۲۰۱۶ء میں اس منصوبے کو ایک حد تک لے جاکر ختم کیا اور اگست ۲۱۰۶ء میں اسے اشاعت کے لیے سپرد کردیا۔چنانچہ ستمبر ۲۰۱۷ء میں یہ منصوبہ فہرست نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان کے نام سے چار جلدوں میں تہران کے مرکز پژوہی میراث مکتوب سے تقریباً تین ہزار صفحات میں شایع ہوگیا ہے۔اس میں پاکستان کے اکثر و بیشتر نجی کتب خانوں کے آٹھ ہزار مخطوطات کے کوائف جمع کیے گئے ہیں۔فہرست کی ترتیب موضوعاتی ہے۔پہلی تین جلدیں فہرست مخطوطات اور چوتھی جلد صرف اشاریوں پر مشتمل ہے۔جلدوار بڑے بڑے موضوعات کی تفصیل حسب ذیل ہے (ذیلی موضوعات کا یہاں تذکرہ نہیں ہوا):

جلد اول: علوم قرآنی، حدیث، کلام، فقہ، اعمال دینی، بیاض ہا، چند دانشی، اخلاق، فلسفہ، منطق، ملل و نحل۔

جلد دوم: عرفان، نسب نامہ ہا، شجرہ نامہ ہا، علوم طبیعی، پزشکی، علوم اجتماعی، ہنر ہا، ریاضی، حساب، ہندسہ، ستارہ شناسی، ستارہ بینی، تقویم شناسی، کیمیا، زبان۔

جلد سوم: ادبیات، جغرافیا، سفرنامہ، تاریخ، علوم غریبہ، افزودہ ہا۔

جلد چہارم: اشاریے اور تصاویر مخطوطات، حسب ذیل سولہ اشاریے دیے گئے ہیں:

۱۔متعارف کتب۔ ۲۔عام کتب۔

۳۔آٹھویں صدی ہجری تک تصنیف ہونے والی بعض اہم کتب۔

۴۔آٹھویں صدی ہجری تک کتابت ہونے والے بعض اہم نسخے۔

۵۔عرض دیدہ والے نسخے۔ ۶۔مصور نسخے۔ ۷۔مہروں اور جلد سازوں کے سجعے۔
۸۔ترقیموں میں درج کاتبوں کے اشعار۔
۹۔مصنّفین، شعرا، مترجمین، شارحین، حاشیہ نویسان۔
۱۰۔کاتب۔ ۱۱۔عام اشخاص۔ ۱۲۔القاب، خطابات، پیشے، سماجی طبقات۔
۱۳۔ادیان، مذاہب، اقوام، کلامی اور عرفانی فرقے، حکومتی خانوادے، شخصی نسبتیں۔
۱۴۔مقامات اور مقاماتی نسبتیں۔ ۱۵۔مقامات کے القاب اور تعریفیں۔
۱۶۔موضوعاتی اشاریہ۔

راقم السطور نے کتاب کے آخر میں ایک شماریاتی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔جس کے مطابق اس کتاب میں: کل کتب خانے: ۳۳۵۔کل عنوانات کتب: ۳۹۸۲۔کل نسخے: ۸۰۰۰۔کسی ایک کتاب کے سب سے زیادہ نسخے: تفسیر حسینی ۱۲۰ نسخے۔سب سے زیادہ جس کتاب پر کام ہوا: اسکندر نامۂ نظامی کی ۱۹ شرحیں اور ۲ فرہنگیں۔

برصغیر میں نجی اور ذاتی کتب خانوں کا المیہ یہ رہا ہے کہ یہ صاحبِ کتب خانہ کی حیات تک ہی قائم اور آباد رہتے ہیں۔اُدھر صاحبِ کتب خانہ نے آنکھیں موندھیں، اِدھر کتب خانے کی بربادی شروع ہوگئی۔موجودہ فہرست میں مذکور اکثر و بیشتر کتب خانے اور ان میں موجود مخطوطات کا حال اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔بہت سے کتب خانے مٹ چکے ہیں اور ان کے مخطوطات تباہ ہو گئے ہیں۔اب صرف ان کے نام ہی اس فہرست میں باقی رہ گئے ہیں۔

اس نوعیت کی فہرستیں ہمیں اپنی تہذیبی، ادبی اور علمی تاریخ رقم کرنے میں ماخذ کا کام دیتی ہیں۔

شیخ فخر الدین عراقی: برصغیر پاک و ہند میں سلسلۂ سہروردیہ کا مرکز ملتان (پنجاب) ہے۔ جہاں شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفۂ مجاز شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی خانقاہ ہے۔عراق عجم سے ایک شاعر اور عارف، شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی (وفات: ۶۸۸ھ/ ۱۲۸۸ء) ملتان آئے۔ سترہ سال یہاں مقیم رہے۔شیخ زکریا ملتانی کے جانشین اور داماد بنے اور پھر روم کو چک (ترکی) اور شام کی طرف ہجرت کر گئے اور وہیں دمشق میں وفات پا کر دفن ہوئے۔شیخ عراقی کی ایک وجہ شہرت ان کی کتاب لمعات اور پر جوش فارسی شاعری ہے۔پاکستان میں ہمارے فاضل دوست، نام و نمود سے

بے نیاز محقق، ڈاکٹر محمد اختر چیمہ (مقیم فیصل آباد) نے شیخ عراقی پر تحقیق کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء میں تہران یونیورسٹی سے تحقیقی فارسی مقالہ "مقام شیخ فخرالدین ابراہیم عراقی در تصوف اسلامی" لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ بعد میں یہ مقالہ اسی نام سے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے دوبار شایع کیا (۱۹۹۴ء، ۲۰۰۶ء با اضافات)۔ اب اسی کتاب سے ماخوذ و ملخص ان کی اردو کتاب احوال و آثار مع رسائل و مکاتیب شیخ فخرالدین عراقی سہروردی (۶۱۰-۶۸۸ھ) شایع ہوئی ہے (اورینٹل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ۲۲۳ صفحات) مقدمہ، تدوین اور اہتمام سید اویس علی سہروردی کا ہے۔ اس کتاب میں شیخ عراقی کے مستند حالات، دو رسائل (رسالہ لطیفہ فی الذوقیات؛ رسالہ فی الحمدلہ و معناھا فی التصوف) اور چھ مکتوب مع اردو ترجمہ شامل ہیں۔

شیخ علی متقی برہان پوری: شیخ علاء الدین علی بن حسام الدین متقی برہان پوری (وفات: ۹۷۵ھ) برصغیر کے اکابر علماء میں سے ہیں جو ہندوستان سے مکہ المکرمہ کو ہجرت کر گئے اور وہیں دفن ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (وفات: ۱۰۵۲ھ) ۹۹۶ھ میں حرمین شریفین گئے تو وہاں شیخ علی متقی کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی منڈوی برہان پوری (وفات: ۱۰۰۱ھ) سے ملے اور ان کے زبان سے شیخ کے جو حالات سنے اور خود شیخ عبدالوہاب کے جو حالات بچشم خود دیکھے، ایک فارسی کتاب زاد المتقین فی سلوک طریق الیقین میں جمع کردیے۔ اصل فارسی کتاب تاحال شایع نہیں ہوئی لیکن اس کے دو اردو تراجم (از ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی، مطبوعہ کراچی، ۱۹۹۸ء اور پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی، مطبوعہ علی گڑھ، ۲۰۰۹ء) دستیاب ہیں۔ شیخ علی متقی کی شہرت ان کی حدیث پر کتاب کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کئی چھوٹے چھوٹے عربی و فارسی رسائل کے مصنف بھی ہیں۔ بعض رسائل تو بالکل گمنام ہیں۔ انھی میں سے ایک فارسی رسالہ التجریب الوافی فی الحبر الصافی راقم السطور کو نیشنل آرکائیوز آف پاکستان کے ذخیرہ مفتی (شمارہ Islam647) سے ملا تھا جسے مرتب کرکے میں نے رسالہ نامۂ بہارستان، تہران، شمارہ ۹-۱۰ (۱۳۸۳ش) میں شایع کروادیا تھا۔ یہ رسالہ روشنائی سازی پر ہے۔ شیخ کو روشنائی سازی کا بہت تجربہ تھا۔ اسی طرح احقر نے شیخ کا ایک اور عربی رسالہ **نعم المعیار والمقیاس لمعرفة مراتب الناس** اپنے خاندانی اور استنبول کے ایک مخطوطے کی مدد سے مرتب کرکے استنبول سے شایع ہونے والے پرچے تصوف، شمارہ ۳۵، سال ۲۰۱۵ء میں شایع کیا۔

اب شیخ علی متقی کے عربی رسائل کا مجموعہ، رسائل المتقی الھندی نام سے ابوالبرکات حق النبی السندی الازھری نے مرتب کر کے شایع کروایا ہے (ناشر: دارالاحسان، قاہرہ، ۲۰۱۶ء، ۱۲۸ صفحات)۔ اس مجموعے میں شیخ کے حسب ذیل رسائل ہیں:

۱۔ ھدایة ربی عند فقد المربی (شرح سلوک الطریق اذا فقد الرفیق)۔

۲۔ سلوک الطریق اذا فقد الرفیق۔

۳۔ التحذیر عن الوقوع فی المھلکة و البلیة لمن شرع فی علم الحقایق بلا اھلیة۔

۴۔ تذکار النعم و العطایا فی الصبر و الشکر علی الفقر و البلایا۔

۵۔ نعم المعیار و المقیاس لمعرفة مراتب الناس۔

۶۔ الغایة القصیا فی معرفة الدنیا۔

فاضل مرتب نے اپنے مقدمے میں شیخ علی متقی کے ان ۶ چھوٹے چھوٹے رسایل کے علاوہ ۲۰ تصانیف کے نام گنوائے ہیں۔ تلاش کرنے سے مزید رسائل ملنے کی توقع بھی ہے۔ امید ہے کہ کسی روز شیخ کے تمام عربی اور فارسی رسائل کا مجموعہ یکجا ہو کر شایع ہوگا۔

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی: مخدوم محمد ہاشم بن عبدالغفور (۱۱۰۴-۱۱۷۴ھ) ٹھٹھہ سندھ کے بہت بڑے حنفی عالم گذرے ہیں۔ کتب کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اکثر دینی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی کم و بیش ۱۲۵ تصانیف کے اسماء محفوظ ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے ایک کتاب حیات الصائمین (فارسی) ہے۔ جس کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی تصنیف کے دوران ''خزانۂ کتب متکاثرہ و نسخ متوافرہ'' انھیں فراہم تھا جس کی مدد سے انہوں نے یہ کتاب تصنیف کی۔ اس کے بعد انہوں نے موضوعی درجہ بندی کر کے ان تمام کتب کے نام لکھے ہیں۔ یہ کل ۳۰۷ کتابیں ہیں۔ مجھے حیات الصائمین میں درج ۳۰۷ کتابوں کی فہرست سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے اسے الگ مقالے کی صورت میں ''خزانۂ کتب و نسخ بہ دست آمدۂ مخدوم محمد ہاشم تتوی'' عنوان سے چھپوا دیا جو میری کتاب سیہ بر سفید (تہران، میراث مکتوب، ۲۰۱۱ء، ص ۳۳-۱۴) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ فہرست اور یہ انداز دیکھ کر مجھے کشف الظنون کے مصنف حاجی خلیفہ چلپی یاد آتے ہیں۔ اگر مخدوم ہاشم کو سندھ کا

"حاجی خلیفۂ ثانی" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ دونوں حضرات کی کتاب دوستی، کتاب شناسی اور کتاب نویسی میں بہت مماثلت ہے۔ مخدوم کی ایک اور تصنیف اتحاف الاکابر بمرویات الشیخ عبدالقادر بھی ایک طرح سے معجم الشیوخ اور ان شیوخ کے حضور پڑھی گئی مولفات کا تذکرہ ہے۔

مخدوم ہاشم کی تصانیف سے ایک عربی کتاب **بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ** ہے جو ابی البرکات حق النبی السندی الازہری کے دراسۃ و تحقیق کے ساتھ بہت عمدہ طریقے سے شایع ہوئی ہے (ناشر: دارالفتح، عمان، ۲۰۱۶ء)۔ یہ کتاب زمانۂ نبوت سے وفات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پیش آنے والے واقعات پر مشتمل ہے۔ مرتب نے مصنف کے حالات پر ایک جامع مقدمہ تحریر کیا ہے اور عمدہ حواشی تحریر کیے ہیں اور حوالوں کی تخریج کی ہے۔ آخر میں سات مختلف اشاریوں سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

مذکورہ بالا دونوں کتب کے مرتب کا تعلق سندھ کے علمی اور روحانی راشدی خاندان سے ہے۔ وہ جوان سال ہیں (تاریخ ولادت: ۱۲ مئی ۱۹۸۱ء)۔ ان کی تعلیم جامعۃ الازہر اور معہد المخطوطات العربیۃ قاہرہ میں ہوئی ہے۔ اس لیے عربی زبان و ادب اور مخطوطات پر تحقیق کا شستہ ذوق پیدا ہوگیا۔ زیادہ توجہ سندھ کے علماے احناف کے کاموں پر ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے شیوخ کے علمی آثار سے بھی خاص دلچسپی ہے۔ اس سن وسال میں ان کی مرتّب کردہ کئی عربی کتب بلادِ عرب سے شایع ہوچکی ہیں اور آگے چل کر ایسے متعدد علمی رسائل و کتب کی تدوین و اشاعت ان کے پیش نظر ہے۔ اب تک ان کی تدوین و شایع شدہ کتب کے اسماء یہ ہیں:

۱۔ الطراز المذهب في ترجيح الصحيح من المذهب، شيخ بدر الدين شهاوی مصری طبع بيروت، ۲۰۱۳ ۲۔ حسن الفهم والتعقّل في جمع الكسب والتوكّل، عبدالواحد سيوستانی، طبع بيروت، ۲۰۱۴ ۳۔ ترتيب مسند الإمام أبي حنيفة، محمد عابد سندی مدنی، طبع قاهره، ۲۰۱۵ ۴۔ حديقة الصفا في أسماء المصطفى، محمد هاشم بن عبدالغفور تتوی، طبع الأردن، ۲۰۱۵ ۵۔ ذكر إجازات الحديث في القديم والحديث (ثبت أسانيد)، شيخ عبدالحق محدث دهلوی، طبع اردن، ۲۰۱۷ ۶۔ ست رسائل في الفقه الحنفي، محمد عابد محدث سندی، طبع بيروت، ۲۰۱۷ ۷۔ كفاية

القاري بشرح ثلاثيات البخاري، حمیدالدین محدث سندی، طبع اردن، ۲۰۱۷۔

مجدّدی ادب: ذکرالسعیدین فی سیرۃ الوالدین تالیف شاہ محمد معصوم مجددی رام پوری (۱۲۶۴۔ ۱۳۴۱ھ/ ۱۸۴۶۔ ۱۹۲۲ء) تحقیق وتعلیق محمد اقبال مجددی، ناشر: تنظیم الاسلام پبلی کیشنز، گوجرانوالہ، ۲۰۱۷ء، ۴۳۳ صفحات۔

یہ کتاب شاہ احمد سعید مجددی دہلوی ثم مدنی (۱۲۱۷۔۱۲۷۷ھ/ ۱۸۰۲۔ ۱۸۶۰ء) اوران کے بڑے بیٹے شاہ عبدالرشید مجددی رام پوری ثم مدنی (۱۲۳۷۔۱۲۸۷ھ/۱۸۲۱۔ ۱۸۷۰ء) کے احوال ومعارف پر ہے۔ پہلی بار ۱۳۰۸ھ میں رام پور سے چھپی تھی اور نایاب ہوچکی تھی۔ محمد اقبال مجددی صاحب نے اسے ازسرنو مرتب کیا ہے اوراس پر مناسب تعلیقات وتوضیحات کا اضافہ کرکے، مقدمہ لکھا ہے۔ کچھ نادر دستاویزات کے عکس بھی دیے ہیں جن میں ان مجددی حضرات کا وہ فتوی بھی شامل ہے جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو جہاد قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے کے لیے کہا گیا ہے۔ ضمیمے کے طور پر دو عربی مخطوطات۔ المناقب الشیخ احمد سعید المجددی تالیف سید حسن تاج کماخی مدنی اور رشحات عنبریہ تالیف محمد مظہر مجددی مہاجر مدنی۔ کے عکس بھی شایع ہوئے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی: مقالات طریقت تالیف عبدالرحیم ضیا، تحقیق وتعلیق محمد اقبال مجددی، ناشر: پروگریسوبکس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ۴۱۶ صفحات

یہ کتاب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۱۵۹۔۱۲۳۹ھ/ ۱۷۴۶۔ ۱۸۲۴ء) کے حالات و تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی اوّلین اشاعت مقالات طریقت معروف بہ فضایل عزیزیہ کے نام سے ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء میں حیدرآباد دکن سے ہوئی تھی۔ مجددی صاحب نے اسے ازسرنو مرتب کیا ہے اوراس پر مصنف اور شاہ عبدالعزیز کے حالات پر ایک مقدمہ لکھا ہے اور مفید تعلیقات کا اضافہ کیا ہے۔ مجددی صاحب کے لیے جدید اشاعت کا محرک، محمد عضدالدین خان صاحب کا مقالہ "مقالات طریقت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حالات میں ایک نایاب تذکرہ" بنا جو معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۶۵ء (ص ۱۸۴۔ ۲۰۰) میں چھپا تھا۔

معارف کی ڈاک

مکتوب احمد آباد

حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر
پیر محمد شاہ روڈ، پانکورناکا، احمد آباد-۱

مکرمی! اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

باری تعالیٰ آپ کو خیر و عافیت کے ساتھ رکھے۔ آمین

چند سال قبل استادان فارسی کی کل ہند کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چند دوستوں کے ساتھ بنارس جانا ہوا تھا، جہاں سے سب دوستوں کے ہمراہ اعظم گڑھ بھی آنا ہوا اور مخدومی اشتیاق صاحب ظلی سے پرخلوص ملاقات ہوئی۔ دس پندرہ دوستوں نے دوپہر کا کھانا بھی وہیں نوش کیا، تب حضرت سید سلیمان ندوی صاحب کے فرزند سے ملاقات ہوئی۔

مولانائے گرامی قدر ضیاء الدین اصلاحی صاحب تو ہمارے یہاں منعقدہ ہر سمینار میں تشریف لاتے رہے اور ان سمینار میں پڑھے گئے ان کے مقالات ہماری لائبریری شائع کرتی رہی ہے۔ چنانچہ اس بار ہم نے اپنی دو تین تازہ مطبوعات آپ کی خدمت میں اس غرض سے روانہ کی ہیں کہ اردو کے موقر اور تاریخی رسالہ "معارف" میں دو چار جملے تحریر کروائے جائیں۔ کم سے کم نئی موصولہ کتابوں کے کالم میں درج ہو جائیں تو بات بن جائے۔

ہمارے بزرگ رفیق کار ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی مرحوم آج ہوتے تو شاید یہ کام یا خدمت بخوبی انجام پذیر ہو جاتی۔

ہماری نئی آنے والی دو کتابیں پریس میں ہیں۔ انشاء اللہ خدمت میں روانہ کروں گا، اگر کسی لائق ہوں نئی کتابوں میں کم سے کم ذکر کر دیں تو آپ کا بڑا کرم ہوگا۔

فقط دعا گو
محمد شفیع مانیئر

ہندوستانی مسلمان: شذرات معارف کے آئینہ میں

خدادادمنزل، موضع سیوری،
پوسٹ منجھول، بیگوسرائے (بہار)

مکرمی جناب مدیر صاحب، ''معارف''، اعظم گڑھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف دسمبر ۲۰۱۶ء کے شمارے میں اپنے شائع شدہ خط کو دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی، اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ کی اس ذرہ نوازی پر عارف عباسی مرحوم کا یہ شعر میرے ذہن کو دستک دینے لگا:

تجھ سے اک ربط خاص ہے ورنہ کون سنتا مرے فسانے کو؟

اسی بنا پر اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ دوسرا خط پیش خدمت ہے۔

جب اپنے برادران وطن کی طرف سے ہمارے ہی ذریعہ فراہم کردہ مواقع کی بنا پر ہمارے عائلی قوانین کے سلسلے میں اور ان ہی کے سر میں سر ملانے والے بعض بزعم خود روشن خیال مسلم بے بنیاد اور منافی اسلام بیانات دیتے ہیں تو دل تڑپ اٹھتا ہے، آنکھیں نم ہوجاتی ہیں اور جگر شق ہوجاتا ہے نیز یہ نفسیاتی کیفیت، ذہنی اذیت اور دماغی کوفت اس وقت دوچند ہوجاتی ہے جب یہی نام نہاد مسلم طبقہ یہ کہہ دیتا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ پوری کمیونٹی کی نمایندگی نہیں کرتا ہے۔ اس گھڑی، قلبی کیفیات اور ذہنی جراحت کا جو عالم ہوتا ہے اس کے اظہار کے لیے سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے:

غیروں نے جو کیا اس پہ آنسو بھی کچھ بہے اپنوں نے جو کیا وہ کوئی کس طرح کہے

جبکہ سچائی یہی ہے کہ یہ مسلمانوں کا متحدہ پلیٹ فارم ہے جس کی تازہ اور درخشاں مثال یہ کلکتہ کا اجلاس ہے جو مندرجہ ذیل شعر کا مصداق ہے:

ایک ہوجائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا بات بنے

اسی ضمن میں عرض ہے کہ اگر بورڈ کی پالیسی اور موقف کے خلاف نہ ہو تو اس کے وابستگان کی ایک عدد فہرست سے نواز کر ممنون و متشکر فرمائیں تاکہ غیر مسلم علاقے میں رہائش پذیر ہونے کے سبب واسطہ پڑنے پر ان سے اور مختلف اذہان کے حاملین و متنوع مسلک کے سالکین مسلمانوں سے تبادلۂ خیال کی صورت میں مدد و رہنمائی مل سکے۔

بہرطور جب مارچ ۲۰۱۶ء کے شذرات میں معارف کی صد سالہ مدت کی تکمیل پر خصوصی شمارے، ''ہندوستانی مسلمان: شذرات معارف کے آئینہ میں'' کی پیش کش کی خبر باصرہ نواز ہوئی تو چہرہ فرط مسرت سے کھل اٹھا تھا اور دل کے تار خوشی کے شادیانے بجانے لگے تھے اور میں سراپا انتظار بن گیا۔

کہہ سکتے ہیں کہ ''ہندوستانی مسلمان: شذرات معارف کے آئینہ میں'' کے عنوان سے ان ضخیم و جسیم اور باتمکنت و باوقار شماروں میں جن شذرات کا انتخاب کیا گیا ہے وہ حسن انتخاب ہے اگر اسے شعری پیرائے میں یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا:

دلکش ہے، لاجواب ہے میری نگاہ میں وہ حسن انتخاب ہے میری نگاہ میں

اور ان میں نہ صرف ہمارے جملہ مسائل کے حل کے لیے نہ صرف رہنما خطوط موجود ہیں بلکہ باشندگان ملک کو درپیش قضایا کے تعلق سے بھی بہترین لائحۂ عمل بتایا گیا ہے۔ اس لیے انہیں ہر اردوداں تعلیم یافتہ گھرانے کی زینت ہونا چاہیے۔ ان دونوں جلدوں کے متعلق مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر عالی مرتبت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب اطال اللہ بقاءہ ونفع بہ المسلمین والانسانیۃ کا گنج گراں مایہ کا آئینہ دار مکتوب مسک الختام ہے۔

یادش بخیر ہندوستانی مسلمان حصہ اول کے صفحہ ۲۹ ''اوقاف اسلامی اور گورنمنٹ''، ص ۱۳۶ ''حق وراثت''، ص ۱۴۷ ''اسلامی محکمۂ قضا کے قیام کا مسئلہ''، ص ۱۸۵ ''اوقاف کی اصلاح و تنظیم''، ص ۲۱۶ ''شادی اور طلاق کی اصلاح سے متعلق پارلیمنٹ میں بل''، ص ۲۳۳ ''اسپیشل میرج ایکٹ'' اور حصہ دوم کے ص ۱۸۱ ''مسلم پرسنل لا اور حکومت'' کے عنوانات سے موجود شذرات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ دارالمصنّفین کے متعلقین کا مسلم پرسنل لا بورڈ کے خدوخال کو ابھارنے اور اس کے قیام کی راہ کو ہموار کرنے میں بھی اہم رول رہا ہے۔ اسی حصے کے ص ۱۸۱ ''مسلم پرسنل لا کنونشن، بمبئی''، ص ۲۴۲ ''یکساں سول کوڈ''، ص ۲۴۵ ''متبنّیٰ بل اور مسلمان''، ص ۲۵۴ ''مطلقہ کا نفقہ''، ص ۲۷۹ ''مطلقہ عورت کے نان ونفقہ کا بل''، ص ۴۳۲ ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' اور ص ۴۶۷ ''مسلم پرسنل لا بورڈ کے عناوین کے تحت پیش کیے جانے والے شذرات مزید اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ بورڈ کے جاری نشاطات وسرگرمیوں میں دارالمصنّفین ہم قدم رہا ہے (۱)۔ خود سید الطائفہ کا عہدۂ قضا پر مامور کیا جانا ہندوستان میں نظام قضا کی تاسیس اور اس کے نقوش ابھارنے کا شاہد عدل اور بین دلیل ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ موجودہ وقت میں دارالمصنّفین کی مجلس منتظمہ کے کتنے حضرات بورڈ کے ارکان اور عہدے ومناصب پر فائز ہیں۔ اگر مطلوبہ فہرست مل جائے تو شاید اس کا علم ہوجائے۔ خاکم بہ دہن میں کسی بدگمانی کا شکار نہیں میں تو صرف صحیح امر سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔

---

(۱) طوالت کے خوف سے متذکرہ شذرات کی پیش کش سے گریز کیا جارہا ہے۔

اسی سلسلۃ الذہب میں ایک مفید کڑی ''مطلقہ عورت اور نان ونفقہ'' شائع کردہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی) کی بھی شمولیت مناسب معلوم ہوتی ہے، جس سے اس غیر معمولی مسئلہ کو اس کے مالہ وماعلیہ کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی آسانی ہوگی۔ یہ خوش آیند بات ہے کہ بورڈ نے اپنے اس اہم اجلاس میں تین طلاق کے بعد بے سہارا ہوجانے والی خواتین کی مالی مدد کے متعلق بھی رہنمائی کی ہے۔

چند گزارشات اور بھی ہیں: ۱۔ ہندوستانی جامعات کے اسلامک اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ اور شعبۂ دینیات کے سربراہان کی شمولیت پر غور وخوض (عدم شمولیت کی بنا پر) تاکہ بورڈ کی دینی وعصری اسلوب میں ترجمانی ہوسکے۔ ۲۔ بورڈ کے اجلاس کے انعقاد کے لیے منتخبہ صوبہ/شہر میں عزت مآب گورنر/عالی جناب وزیراعلی/معزز ضلع انتظامیہ کی شرکت۔ ۳۔ وکلاء، ادباء، شعرا، بشمول مسلم وغیر مسلم خطاب۔ ۴۔ مدیران اخبار وجرائد سے (بشمول اردو، ہندی، انگریزی ودیگر زبان) بورڈ کے کام اور پیغام کو عام کرنے کی غرض سے رابطہ۔ ۵۔ غیر مسلم کی اکثریت والی آبادی میں رہائش پذیر مسلم اقلیت کی رہنمائی اور ان غیر مسلم آبادی کی آگاہی کے لیے بورڈ کے اجلاس کے منعقد کرنے پر غور وخوض۔ ۶۔ بورڈ کے افادۂ عامہ اور واقفیت تامہ کی غرض سے یک سالہ ودوسالہ ڈپلومہ کورس کا آغاز۔

یہ چند گزارشات تھیں جنہیں سپرد قلم کرنے کی کوشش کی۔ آیندہ وقت اور حالات کے تحت پیدا ہونے والے خیالات اور تجاویز کے سلسلہ میں بھی رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش رہے گی۔

فقط محتاج دعا

خوردانہ خواہش کی بزرگانہ تکمیل کا منتظر

جناب راجو خاں

مکتوب کینڈا

وھٹبی، کینڈا

محترم ظلی صاحب۔ سلام مسنون!

مولانا محمد اسلم قاسمی کے سانحہ ارتحال پر آپ کا تعزیت نامہ مرہم بن کر صادر ہوا۔ بطور مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ سب کی آخری منزل ایک ہی ہے۔ تاہم غم مفارقت کا ہوتا ہے اور مخلص دوستوں کی ہمدردی اس غم کو انگیز کرنے کی ہمت دیتی ہے۔ فجزاک اللہ احسن الجزاء۔

میں یکم اگست کو سفر ہند سے واپس کینڈا آیا۔ ایک مہینہ علی گڑھ، لکھنؤ اور حیدرآباد تین شہروں میں گزرا۔ پوری مدت قیام میں کھانا پینا تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ فضائی اور ماحولی آلودگی نے کم از کم میرے لیے غذا

تک کو مسموم کر دیا تھا اور ایک ماہ غذا سے زیادہ دواؤں پر گزر بسر رہی۔ واپس آ کر بھی چند روز اس کا اثر رہا۔ اب الحمدللہ ٹھیک ہوں۔

ادھر غیر حاضری طویل ہو گئی۔ چار کتابوں نے باندھ رکھا ہے۔ تین زیر قلم (اگرچہ اب قلم کا وجود کہاں باقی رہا) اور ایک زیر نظر۔ زیر تحریر ایک کتاب انصاریان وسطی وجنوبی ایشیا کی سوانحی موسوعہ ہے جس میں تین سو سے زیادہ اولاد انصار مدینہ کا سوانحی تذکرہ جمع کیا ہے جو تقریباً سات سو سال سے برصغیر میں اور ایک ہزار سال سے افغانستان میں آباد ہیں۔ دوسری کتاب مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی، اول ناظم دینیات علی گڑھ کالج، کی سوانح ہے۔ وہ تالیف تو مولانا راشد کاندھلوی کی ہے۔ میں ایڈیٹنگ اور نظر ثانی کر رہا ہوں جو خود بھی خاصا تحقیقی کام ثابت ہو رہا ہے۔ عرصہ دراز سے سلطنت عثمانیہ پر ایک مختلف نقطۂ نظر سے کتاب اردو اور انگریزی میں ادھوری پڑی ہے۔ اب اس کے تحریر شدہ انگریزی حصہ پر نظر ثانی کر رہا ہوں ایک ترک دوست کو پیش کرنے کے لیے۔

اوپر سے ایک ہزارہ کتاب کا مطالعہ۔ ممتاز مفتی کی کتاب الکھ نگری عرصہ ہوا پڑھی تھی۔ ادھر علی پور کا ایلی دستیاب ہوئی تو ہزار صفحہ کی اس کتاب کو بھی قسطوں میں پڑھ ڈالا۔ ممتاز مفتی نفسیات اور بدنی حسیات کی راہ سے بات کرتے ہیں۔ اسی اعتبار سے اس کتاب پر گفتگو ایک مستقل مہم ہے۔ مجھے ممتاز مفتی کے موضوعات سے تو کبھی دلچسپی نہیں ہوئی البتہ الکھ نگری کو غیر رسمی تاریخ کی حیثیت سے پڑھا تھا۔ اس میں دعوے تو بہت ہیں دلائل مفقود ہیں۔ خیال تھا کہ علی پور کا ایلی اسی نوع کی کتاب تقسیم ہند سے پہلے کے زمانہ پر محیط ہوگی۔ زمانہ تو حسب خیال ہی نکلا مگر اس میں کوئی دعویٰ بھی نہیں ہے۔ بس ایک بے منزل شخص اور بے منزل معاشرہ کی بے سروپا سرگزشت ہے۔ اس قصہ میں عورت ناگن ہے یا کسی ناگ کی ڈسی ہوئی مخلوق۔ اس سے اس دور کے مزاج اور سماج کا کچھ اندازہ لگایا جائے تو خیر۔

بڑی تاخیر سے معارف کے لیے کچھ ارسال کر رہا ہوں۔ ایک مضمون "انصار کی ہجرت" ہے اور کچھ منظومات۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران ایک غزل بحالت بیکاری و بیماری ہوئی تھی۔ وہ بھی پیش خدمت ہے۔

والسلام مع الاکرام۔ طالب خیر و دعا

محمد طارق غازی

پس تحریر: آپ تجربہ سے جانتے ہیں کہ اردو میں کتاب لکھنا دیوانگی ہے اور اسے چھاپنا اس سے بڑی دیوانگی ہے۔ اس کے باوجود آپ ہم اس کار لائقہ میں ملوث ہیں اس علم کے باوجود کہ پڑھنے والوں کا شمار کریں تو گننے کے بعد ہاتھ کی کچھ انگلیاں پھر بھی بچ رہتی ہیں۔ بہر حال ہم جیسے لوگ مل جل کر یہ ظلم انگیز کرتے ہیں۔ تو سوچتا ہوں کہ نظریۂ تہذیب کا کچھ ذکر معارف میں ہو گیا تو شائد کچھ اہل علم کو اس حادثہ کی خبر ہو جائے۔

ادبیات

نعتیں

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی*

مجالِ نطق ہے جب تک مری زباں کے لیے زباں ہے مدحتِ سرتاجِ انس و جاں کے لیے
خدا کا ذکر ، نبیؐ پر درود ، رحمت ہیں ہمارے دل کے لیے اور ہماری جاں کے لیے
جو انؐ کی راہ سے ہٹ کر، نجات ڈھونڈتے ہیں وہ مر رہے ہیں بس اک سعیِ رایگاں کے لیے
انہیں کو زندگیِ جاوداں ہوئی حاصل جو مٹ گئے شہہِ بطحا کی عزّ و شاں کے لیے
نبیؐ کے چاہنے والو! نہیں یہ منزلِ عیش جہاں میں آئے ہو تم، صرف امتحاں کے لیے
بہت بلند ہے مقصد نبیؐ کی مدحت کا میں نعت لکھتا نہیں نام اور نشاں کے لیے
رئیسؔ غیر کے در پر کبھی جھکا ، نہ جھکے کہ اپنا سر ہے فقط رب کے آستاں کے لیے

ڈاکٹر انس مسرورؔ ترابی**

جانے کس قریہ سے خوشبو یہ صبا لائی ہے صبح دم شہرِ نبی کی بڑی یاد آئی ہے
موسمِ ہجر کو رخصت کی اجازت ہو کہ اب دل بھی ہے شوق طلب جاں بھی تمنائی ہے
ان کی یادوں کے اجالے ہیں کہ جشنِ تقدیس کس قدر نور فشاں عالمِ تنہائی ہے
اور بھی منظرِ خوش رنگ ہیں نظروں میں مگر دل مرا دید مدینہ کا تمنائی ہے
جب مصیبت میں کسی نے بھی سہارا نہ دیا بے طرح ٹوٹ کے سرکار کی یاد آئی ہے
آپ کے خلق کا اعجاز ہے طیبہ والے جس کو دیکھو وہی وارفتہ و شیدائی ہے
ذکرِ سرکار کی خوشبو سے ہے نکہت افشاں دل مرا ہے کہ کوئی لالۂ صحرائی ہے
برکتوں والے پیمبر ہیں خدا کے مسرورؔ
ذکر سے ان کے مزین سخن آرائی ہے

---

* گوشۂ مطالعات فارسی، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱۔

** چیئرمین چودھری احمد اللہ میموریل سوسائٹی، سکراول، ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر ۲۲۴۱۹۰۔ (Mod:9453347784)

ڈاکٹر سید مجیب الرحمٰن بزمیؔ*

نازشِ یزداں، فخرِ رسولاں، ذات مکرم کملی والے
عرش کے جلوہ، نور کے پیکر، حسنِ مجسم کملی والے

چھوٹ جبیں کی صبحِ ازل ہے زلف کا پرتو شامِ ابد ہے
افضل و اعلیٰ، اول و آخر عرش کے محرم کملی والے

دشمن پر بھی چشمِ عنایت، سب کے لیے پیغامِ محبت
ظاہر و باطن دونوں یکساں، خلق کے ہمدم کملی والے

اسمِ مبارک چارۂ غم ہے، دنیا پر اک خاص کرم ہے
وجہہ دو عالم کملی والے، جانِ دو عالم کملی والے

ہادیٔ برحق، رہبرِ کامل، شافع محشر، زینتِ محفل
ناز سلیماںؑ، حسرت عیسیٰؑ نازشِ آدم کملی والے

خالق کا فرمان سنایا، فرقوں کو ایک کنبہ بنایا
کیسے نہ بجھتا شعلۂ نفرت، پیار کی شبنم کملی والے

ہجر کی آگ سے روشن سینہ، آنکھوں میں تصویر مدینہ
اتنا بتادو بزمیؔ جھیلے، کیسے شبِ غم کملی والے

محمد امین احسن**

تاروں سے یہ کہہ دو کوچ کریں خورشید منور آتے ہیں
اور اہلِ زمیں کو مژدہ ہو، خورشید منور آتے ہیں (ماہرالقادری)

کیا بات تمھیں ہم بتلائیں، کیا علم تمھیں ہم سکھلائیں
بس صبر ذرا اتنا اور کرو، خورشید منور آتے ہیں

قوموں کی بلندی پستی کی، تاریخ شہادت دیتی ہے
کیوں خود کو پریشاں کرتے ہو، خورشید منور آتے ہیں

آنکھوں کو ذرا کھولو اپنی، سب صاف نظر آجائے گا
پردے میں نہاں ہر راز عیاں، خورشید منور آتے ہیں

چڑیوں کی چہک پھولوں کی مہک سب ان کی بلائیں لیتی ہیں
مہتاب بھی ہنس ہنس کہتا ہے، خورشید منور آتے ہیں

برسات کی ننھی بوندوں نے پیغام زمیں کو پہنچایا
فصلوں کے بدن گدرائیں گے، خورشید منور آتے ہیں

بس ایک اشارہ کافی ہے منزل ہی قدم کو چومے گی
رستے کا مقدر چمکے گا، خورشید منور آتے ہیں

اپنوں میں رہے برسوں لیکن غیروں کی کبھی نہ یاد آئی
اب شیر و شکر ہوجائیں گے، خورشید منور آتے ہیں

دنیا نے سجائی ہے محفل، اعلان ہمیں ہی کرنا ہے
الفاظ و معانی سب ان کے، خورشید منور آتے ہیں

---

* ہومیو شفا خانہ، رحمت کالونی، ڈورنڈا، رانچی ۸۳۴۰۰۲۔ (Phone0651-2490280)

** بلریا گنج، اعظم گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

قرآن مجید بحیثیت ماخذ سیرت: از مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۳۶، قیمت: ۳۰۰/روپے، پتہ: ادارہ دعوت القرآن، کلن کی لاٹ، امین آباد، لکھنؤ، ۲۲۶۰۱۸۔

رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ عالم انسانیت کے دوسرے بے شمار انبیاء و مصلحین کی زندگی کے برعکس آپؐ کی پوری زندگی، زمان ومکان کے حدود وثغور سے ماوراء ہے، قرآن مجید نے آپؐ کی زندگی کو قیامت تک کے لیے اسوہ ونمونہ بنا کر گویا ایک حقیقت پر مہر بھی ثبت کی اور دوسری طرف اس کے ناگزیر ہونے کا ایسا اعلان کیا جس کی تردید باوجود ہزار مخالفت وعناد کے ممکن نہیں۔

سیرت رسولؐ کا مطالعہ قرآن کے آئینہ میں وہ کامل یقین عطا کرتا ہے جس کو غیر قرآن خصوصاً تاریخ وسیر، عطا کرنے میں کوتاہی وکمی کا احساس دلا جاتے ہیں، اسی احساس نے فاضل مصنف کو دارالمصنّفین کے ایک مذاکرۂ علمی میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع دیا اور موضوع اور صاحب موضوع کی برکت نے اس کو ایک نہایت مفید اور چند پہلوؤں کے لحاظ سے منفرد کتاب کا قالب عطا کردیا۔ مولانا اصلاحی کی اس تحریر کو تحریک علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر سے ملی، ان دونوں بزرگوں کی نظر اس گوشہ پر خاص تھی کہ اصلاً سیرت نگار کے لیے اصل ماخذ ومرجع ومصدر خود قرآن مجید ہے مولانا آزاد کو تو یہ مرتبہ یقین حاصل تھا کہ اگر دنیا سے تاریخ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہوجائیں، جب بھی حضور اکرمؐ کی سیرت وحیات کی کوئی علامت مٹ نہیں سکتی، مولانا آزاد کو تعجب تھا کہ اصحاب سیر نے باوجود کمال سعی کے اس نکتہ پر اصل توجہ کیوں نہ مرکوز کی، مولانا آزاد کی یہ بیش قیمت تحریر مصنف محترم نے غالباً اسی لیے جزو کتاب بنادی کہ خود کتاب کا سبب ومقصد واضح ہوجائے اور حقیقت یہی ہے کہ کتاب کی دو فصلوں میں شخصیت اور سیرت کا جس عمدگی سے استیعاب کیا گیا اور سیرت طیبہ کے قریب ہر پہلو کو قرآن مجید کے بیان ونظر سے پیش کرنے کی سعی کی گئی وہ مصنف کے مطالعہ قرآن کی گہرائی کی شاہد ہے۔ وہ مدرسۃ الاصلاح میں تفسیر وادب کے نامور استاد ہیں، اس لیے ان کو حق بھی تھا کہ وہ ایک ایسے موضوع کی محنت کی سعادت حاصل کریں، جس کی توفیق چند ہی کو حاصل ہوئی، کتاب کی ایک خوبی اس کا سادہ، سلجھا، آسان اور دل میں اتر جانے والا اسلوب ہے، بعض متروک الفاظ بھی اس میں

اچھے لگے جیسے لفظ اشغُلا بمعنی شگوفہ۔ ناشر محترم ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی نے کتاب کی اشاعت کو قابل فخر محسوس کیا، قارئین ایسی عمدہ کتاب کے لیے مصنف کے ساتھ خود کو مقام شکر پر دیکھ سکتے ہیں۔

دینی اداروں اور جماعتوں کی ذمہ داریاں: ازمولانا محمد قمرالزماں الہ آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۵۵۲، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ دارالمعارف الہ آباد، بی/ ۹ ۶۳، وصی آباد، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳۔ جناب محمد عارف خیرآبادی، خدیجہ لائبریری، شیخ پور، خیرآباد سے بھی مل سکتی ہے۔

انسانی معاشرہ ہے تو فتنوں، آزمائشوں اور برائیوں کا بھی وجود ہے، صورت و ماہیت اور قسمیں وقت اور حالات کے زیر اثر الگ الگ ہوسکتی ہیں، شر اسی طرح ہمہ اقسام ہے جس طرح خیر، دور حاضر کے بعض فتنے تو وہ ہیں جن کی بنا پر کئی سابقہ قومیں عذاب کی مستحق ٹھہریں اور ایسے فتنے بھی ہیں جو اسلام سے نسبت رکھنے والی بعض پرانی قوموں کے زوال و ذلت کا سبب بنے، قرآن مجید اور احادیث شریفہ کا مقصد بھی ان فتنوں سے ہمہ وقت باخبر رہنا اور امت کے لیے ان کے ضرر رساں ہونے سے پہلے ہی ان کا تدارک کرنا ہے، امت میں اصلاح وارشاد کا سلسلہ زریں اسی فکر کا نتیجہ ہے، زیر نظر کتاب میں اسی اجمال کی تفصیل ہے، اس میں اول تو فتنوں کا ذکر ہے، ان سے حفاظت کا طریقہ ہے، اہل حق کے غیر منقطع سلسلہ کا تذکرہ ہے، اس کے بعد امت کے جس طبقہ پر اصلاح وہدایت کا سب سے بڑھ کر فرض عائد ہوتا ہے یعنی علماء اور اہل مدارس، مشائخ اور اصحاب جبہ ودستار، دعاۃ ومصنّفین اور پھر اہل سیاست و ثروت، ان سب کی ذمہ داریوں کو بڑی دردمندی سے بیان کرکے یاد دلایا گیا ہے، مولانا سید محمد رابع ندوی نے مقدمہ میں اس اہم پہلو کی جانب توجہ دلائی کہ "مسلمان عوام کے غلط رسوم اور بدعتی اعمال تو عام ہی ہیں، دینی تعلیم و تعلم کے حلقوں میں بھی ایسی برائیاں ہیں جو بہت فکر و توجہ کی محتاج ہیں"۔ علم کے قال کے ساتھ معتدبہ درجہ تک عمل کے حال کا اطمینان ہونا ضروری ہے، مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم نے بہت پہلے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ اکثر مدرسے کاروباری افراد، اہل وجاہت اور سیاسی قسم کے لوگوں کی آماج گاہ اور ان کا ذریعہ عزت و وجاہت بنتے جارہے ہیں اور اس میں اعزہ پروری واقربا نوازی عام ہوتی جارہی ہے۔ یہ پورا مضمون بڑا چشم کشا ہے اور برسوں بعد بھی اس کی معنویت میں ذرا کمی نہیں آئی، یہ پورا مضمون مرتب گرامی نے افادہ عام کی غرض سے کتاب میں شامل کردیا ہے، نفع وافادہ مرتب گرامی کی ہر

کتاب کا جوہر ہے، اس کتاب کا ورق ورق اسی جوہر کا شاہد ہے، اس لیے بزرگوں کی یہ تلقین برحق ہے کہ یہ کتاب سارے مدارس اور سارے اصحاب علم کے مطالعہ میں آنی اور رہنی چاہیے۔

آخری شجر: از جناب رضوان احمد فاروقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۸، قیمت: ۲۵۰/روپے، پتہ: دانش محل، امین آباد، لکھنؤ اور نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج لکھنؤ 226018۔

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد بہترین معلم و مربی، بہترین صاحب قلم، بہترین مصنف، عمدہ ناقد اور صاحب نظر محقق تھے اور ان تمام خوبیوں سے بھی زیادہ وہ ایک نیک نفس، مخلص اور دردمند دل رکھنے والے انسان تھے، ان کی شہرت و مقبولیت کے لیے اتنا ہی کافی تھا لیکن شاعری اور اس سے زیادہ مشاعروں کی نظامت کی قبا نے ان کی قامت کی درازی کو جس طرح زیبائش بخشی، اس کی چمک دمک میں ان کے واقعی صفات کچھ چھپ سے گئے، شاید زندگی میں ان کو اس مستوری و محجوبی سے کچھ شکایت بھی رہی ہو لیکن دوسروں کو اگر اس کا شکوہ رہا تو زیر نظر کتاب سے یقیناً اس کا گلہ جاتا رہے گا۔ اور اس سچے ملک زادہ سے شناسائی بلکہ عقیدت ہو جائے گی جو کبھی خود کو موج تہہ نشیں سمجھ کر اس تڑپ کی طلب میں تھا جو موجوں کی اچھال میں ہوتی ہے، جو اس دنیا کو دشت پرسراب سمجھتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ اس کے پیروں میں آگہی کی زنجیریں ڈال دی جائیں، جس کی شاعری میں مقتل، کوچہ قاتل، صلیب ودار کے استعارے اس طرح تھے کہ ہر لفظ پریشان، ہر مصرع ایسا اداس کرنے والا ہوتا کہ وہ خود کہہ اٹھتا کہ ع ہم اپنے شعروں کے مفہوم پر پریشاں ہیں۔ ملک زادہ کو سمجھنے کے لیے علامات خوں چکاں کو روایات عہد سمجھنے کا حوصلہ چاہیے، یہی وجہ ہے کہ مولانا رابع حسنی ندوی سے ناظم بریلوی تک قریب پچاس سے زیادہ ایسے زاویے اس کتاب میں ہیں جن سے دیکھنے والوں کے تنوع کے ساتھ دیکھے جانے والے کے صد پہل رخ گردش کرتے نظر آتے ہیں، بعض مضامین تو معرکے کے ہیں جیسے جناب حفیظ نعمانی، جنہوں نے جب یہ کہا کہ منظور صاحب مرحوم کی کتاب رقص شرر، یادوں کی برات اور شہاب نامہ کی صف میں ہے تو یہ مبالغہ نہیں، یہ جملہ بھی خوب ہے کہ رقص شرر ایک اسکالر کی طرح میز کرسی پر لکھی گئی ہوتی تو شاید وہ یکتائے زمانہ خودنوشت ہوتی، محسن عثمانی کی نظر میں رقص شرر اس لیے بہتر ہے کہ وہ شرافت قلم کا نمونہ ہے، کیا خوب لکھا کہ اچھی اردو لکھنا کوئی آسان کام نہیں یہ موتی پرونے، ہیرے تراشنے، گل کترنے،

لفظوں کا چراغاں کرنے اور جملوں کی آتش بازی کرنے کا ہنر ہے اور منظور صاحب مرحوم اس ہنر سے آشنا تھے، آخری شجر کی ہر شاخ پُر ثمر ہے، مرتب نے رفاقت و عقیدت کا حق ادا کیا کہ آخری شجر کی شکل میں آخر شب کے ہم سفر کو اسی طرح زندہ و توانا دکھا دیا جس طرح وہ شہر سخن کی تعمیر کے آغاز میں تھا۔

چراغ شب گزیدہ: از جناب الطاف احمد اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۲، قیمت (ہدیہ؟) ۱۵۰/ روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز، ۱۰۔ اعظمی اپارٹمنٹ این۔ا، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

جناب الطاف احمد اعظمی کے بارے میں ایک رائے ہے کہ ان کا ذہن حالات کے جبر سے رہائی کے راستے ڈھونڈتا رہتا ہے۔ ان کی بعض علمی و مذہبی تحریروں اور تجزیوں سے ان کے پڑھنے والوں کو اس کا احساس بھی ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں تنوع، تفکر، تجدد کی وہ تمام کرشمہ سازیاں ہیں جو بیک وقت مدح و قدح کا منظر پیش کرتی جاتی ہیں، عموماً مذہبیات میں یہ اثر زیادہ ہے، ادب و تحقیق میں بھی جداگانہ رنگ اپنی شوخی دکھا جاتا ہے، لیکن شاعری ان کے لیے وجہ شہرت و شناخت نہیں کہی جاسکتی، جناب عابد رضا بیدار کو حیرت ہوئی تو حیرت نہیں کہ ثقہ پن اور سخن گوئی میں بظاہر میلوں کا فاصلہ ہے، عالم فاضل ہو کے شاعری کرنا اور سچ مچ کی شاعری! اس تعجب کو قرار بھی بس اس سے ملا کہ مثالیں اور بھی ہیں کہ علم شاعری کے راستہ میں حجاب اکبر نہیں بنتا، چراغ شب گزیدہ سے پہلے فغان شب کے وقت ہی یہ حجاب اٹھ چکا تھا لیکن چراغ شب گزیدہ میں عقل والوں سے خطاب ہی اول اول ہے کہ ان کی فکر کو مضطرب اور دل کو غم ناک نہیں ہونا چاہیے کہ خالق ارض و سما ء ماورائے سرحد ادراک ہے اور حاصل ادراک بھی معاً بتا دیا گیا کہ

تیری تعریف ہم کریں کیسے — عقل درماندہ ہے زباں عاجز
لفظ حیران ہیں بیاں عاجز — بس تحیر ہے حاصل ادراک

باقی غزلوں کی ایک دنیا ہے اب یہ کیسے آباد ہے، اس کے لیے چراغ شب گزیدہ کو ڈھونڈنا ہوگا، باقی بات اتنی ہے کہ

سب سے کہہ دیتا ہے احمد حالِ دل — اس کے دل کی سادگی کو کیا کہیں

ع۔ص

رسید کتب موصولہ

افادات علم وحکمت: ڈاکٹر محمد فرمان ندوی، مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

قیمت=/۱۰۰روپے

التحریر و التحبیر فی اصول التفسیر: ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، دار عمار، للنشر والتوزیع، عمان۔

قیمت درج نہیں

الموجز فی اصول التفسیر: ڈاکٹر محمد فرمان ندوی، جامعۃ ام المومنین عائشۃ للبنات، رائے بریلی۔

قیمت درج نہیں

دانش راہ بین (نذر پروفیسر عبد الرحیم قدوائی): محمد حارث بن منصور، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔

قیمت=/۵۰۰روپے

سرسید اور اردو زبان وادب: پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

قیمت=/۲۰۰روپے

شوکت پردیسی فکروفن کے آئینے میں: حبیب سیفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔

قیمت=/۲۶۰روپے

عظمت شبلی: مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ، مرتبین ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی ومحمد معتصم اعظمی، اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔

قیمت=/۵۰۰روپے

غزلستان برار (غزلیات شعرائے برار): ضمیر ساجد، ضمیر ساجد، الفاظ کمپیوٹر، نزد مومن پورہ مسجد، اکولہ۔

قیمت=/۱۶۳روپے

مناظر عاشق ہرگانوی، توشیحی نظم: پروفیسر عبد المنان طرزی، دار الاشاعت مصطفائی، دہلی۔

قیمت=/۱۵۰روپے

نقوش سیرت نبویؐ: ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی۔

قیمت=/۲۰۰روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		100/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	〃	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم	〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)		150/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
December 2017 Vol - 200 (6)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

شبلی صدی مطبوعات

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دار المصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	شذرات سرسید	پروفیسر اصغر عباس	500/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۳۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۴۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۵۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۶۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۷۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۸۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۹۔	الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۲۰۔	الندوہ (جلد ۱۔۴)		2175/-
۲۱۔	الندوہ (جلد ۵۔۹)		زیر طبع